پروفیسر وقار علی شاہ

فہرست

تعارف

فخرِ افغان باچا خان کی قد آور شخصیت کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ پختون قوم کے لیے ان کی علمی، ادبی، سیاسی اور اصلاحی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ پورے جنوب ایشیا اور وسط ایشیا میں ان کے افکار کی گونج اب بھی تمام تر آب وتاب کے ساتھ باقی ہے۔ عہد حاضر میں نفرتوں، جنگوں اور تشدد کی جو لہر انسانی تہذیب کی بقا کو خطرے میں ڈال رہی ہے اس کا منہ موڑنے کے لئے باچا خان کی عدم تشدد، امن پسندی اور انسان دوستی کی پالیسی کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ باچا خان کی شخصیت اور ان کی تحریک پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں اور عہدِ حاضر ان کی زندگی اور جدوجہد کی نت نئی جہتوں سے روشناس ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ ان کے طرزِ فکر اور ولولہ انگیز سحر کا قدرداں ہے۔

باچا خان کی تحریک میں لائی جانے والی حالیہ اصلاحات، بیرونی ممالک میں مقیم پختونوں کی پختون قومی تحریک کے احیاء میں دلچسپی اور پختونخوا میں پھیلائے گئے شدت پسندی کے رجحانات اس بات کے متقاضی ہیں کہ عوامی سطح پر باچا خان کی شخصیت اور افکار کو اجاگر کیا جائے۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے باچا خان ریسرچ سنٹر نے پختون معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کرنے کے ساتھ ساتھ باچا خان کی زندگی، جدوجہد اور خدائی خدمتگار تحریک پر تحقیق کا ذمہ اپنے سر لیا ہے۔ ہم جناب ڈاکٹر سید وقار علی شاہ صاحب کے انتہائی ممنون ہیں جنھوں نے باچا خان کے سوانحی تحقیقی مطالعہ کا بیڑا اٹھایا اور اسے پایہ تکمیل

تک پہنچایا۔ ہم محترمہ ڈرنایاب صاحبزادہ کے بھی تہہِ دل سے ممنون ہیں جنہوں نے عام قارئین کے لئے اس کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔

ڈاکٹر فضل الرحیم مروت
چیئرمین باچا خان ریسرچ سنٹر

باچاخان

خان عبدالغفار خان المعروف باچاخان کے بارے میں کئی ایک سوانحی مطالعے دستیاب ہیں لیکن بنیادی طور پر ان میں ان کی شخصیت اور انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ ان کی وابستگی کے مختلف مراحل کو مرکز بنایا گیا ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا موضوع ان کی زندگی، عہد اور جدوجہد کا مطالعہ اور تجزیہ ہے اس کے علاوہ اس مقالے میں خاص طور پر جدوجہدِ آزادی، پختون قوم پرستی کے احیاء اور پختون معاشرے میں عدم تشدد کی مقبولیت میں ان کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زیرِ نظر سطور میں ایک معاشرتی مصلح، ایک ماہرِ تعلیم اور ایک سیاستدان کے طور پر بھی باچاخان کے کردار کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس مقالے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں باچاخان کی زندگی اور ہندوستان میں برطانیہ کے سامراجی عہد کے دوران اپنے حقوق کے حصول کے لئے پختون قوم کو سیاسی طور پر متحرک کرنے میں ان کے کردار کا تجزیہ اصل ماخذ سے حاصل کردہ معلومات کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں بھی ذکر ہوا کہ اس مقالے کا مرکزی موضوع جدوجہدِ آزادی میں باچاخان کا کردار ہے، تاہم قارئین کو ان کی زندگی اور عہد سے بہتر طور پر روشناس کرانے کی غرض سے آخر میں ان کی بعداز تقسیم ہند سرگرمیوں کا بھی ایک مختصر بیان موجود ہے۔

ہندوستانی تاریخ کی تشکیل و ترتیب میں شمال مغربی سرحدی صوبے (پختونخوا) نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ دفاعی لحاظ سے اس کا جغرافیائی محلِ وقوع اسے نہ صرف ہندوستان کی سرحد بنائے ہوا تھا بلکہ فوجی نکتہ نگاہ سے پوری برطانوی سلطنت کے لئے اس کی حیثیت ایک بین الاقوامی سرحد کی سی تھی۔ اس علاقے میں انگریزوں کی آمد تاخیر سے ہوئی اور اس کا

سبب بھی اس کا جغرافیائی محل وقوع ہی تھا۔ان علاقوں سے یہ خطہ کافی فاصلہ رکھتا ہے جہاں سے انگریزوں نے برصغیر تک اول اول رسائی پائی تھی۔شمال مغربی سرحدی صوبہ چونکہ ''شاہراہ فتوحات'' پرواقع ہے اس لئے آریہ اور موریہ اقوام سے لے کر اہلِ فارس ویونان اوران کے علاوہ سکائی، باختری وآلمانی نسلوں اور پھر کشانوں اور مسلمانوں تک حملہ آوروں اور فاتحین نے برِصغیر میں داخلے کے لئے اسی راستے کو چنا تھا۔قرونِ وسطیٰ کے دوران اوراس کے بعد انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ربع اول تک یہ علاقہ شمالی ہندوستان اورافغانستان کی مسلمان سلطنتوں میں شامل رہا ہے۔پختونوں کے اندرونی نفاق کی بدولت پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ کو بھی یہاں پشاور پر اپنا قبضہ جمانے کا موقع ملا تھا۔تاہم ۱۸۴۹ء میں سکھوں کی شکست اور پنجاب کے انضمام کے بعد انگریزوں نے سکھ سلطنت کے ایک حصے کی صورت میں سرحد کے علاقے کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔یہ علاقہ ۱۹۰۱ء تک پنجاب کا حصہ رہا۔اسی سال وائسرائے ہند لارڈ کرزن Lord Curzon نے ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے اضلاع کو الگ کر کے اور مالاکنڈ، خیبر، کرم اور شمالی وجنوبی وزیرستان کی پانچ قبائلی ایجنسیوں کے ساتھ ملا کر ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے کے نام سے ایک الگ صوبہ قائم کر دیا۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اس صوبے کی بعض نمایاں خصوصیات کی بدولت سامراجی عناصر اس کے ساتھ ایک خصوصی رویہ رکھتے تھے۔سلامتی سے متعلقہ امور اور تفکرات کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی نوعیت کی اصلاحات کے مقابل ترجیحی حیثیت حاصل تھی۔ہندوستان کے دیگر صوبوں کے برعکس صوبہ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ نہیں ہوا کرتا تھا اور اس صوبے کا انتظام عمداً ''خصوصی آرڈیننسوں'' کے ذریعے چلایا جا رہا تھا۔یہاں

اصلاحات کے نفاذ سے گریز سے سامراجی حکومت کا مقصد یہ تھا کہ مقامی افراد اپنے صوبے کے لئے برابر حیثیت کا مطالبہ کرنے کا حوصلہ نہ کرسکیں۔

باچاخان کی پیدائش وابتدائی زندگی:

خان عبدالغفار خان ۱۸۹۰ء میں ضلع پشاور کے گاؤں اتمانزئی (چارسدہ) میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں پختونوں میں تاریخ پیدائش محفوظ رکھنے کا رواج عام نہیں تھا۔ خان عبدالغفار خان کی پیدائش کے دن، ماہ اور سن کے بارے میں یقینی معلومات کے فقدان کا بنیادی سبب یہی ہے۔ تاہم خود خان عبدالغفار خان کے مطابق ان کی والدہ نے انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ گیارہ برس کے تھے جب ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی شادی ہوئی۔ ڈاکٹر خان صاحب کی شادی ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۹۰ء خان عبدالغفار خان کا سن پیدائش ہے۔ ان کے والد بہرام خان محمدزئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک خوشحال زمیندار تھے۔ خان عبدالغفار ان کی چوتھی اولاد تھی۔ اس وقت کی عام روایات کے مطابق خان عبدالغفار خان کو قرآن کریم کا درس لینے ایک مقامی مسجد بھیجا جاتا تھا۔ پختون قوم مذہبی تعلیم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان کی اکثریت اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے مساجد بھیجتی ہے۔ اس صوبے میں بمشکل ہی کوئی سکول تھا۔ اس لئے صوبہ سرحد تعلیمی لحاظ سے برطانوی ہند کا پسماندہ ترین صوبہ تھا۔ مزید برآں ہندوستان کے دیگر حصوں میں سامراجی حکومت کی علماء نوازی کے برعکس یہاں کے بااثر دینی رہنما اسٹیبلشمنٹ سے برسرپیکار ہی رہتے تھے۔ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ جدید تعلیم غیر اسلامی ہے۔ مسجدوں وغیرہ میں یہ شعر اکثر پڑھا جاتا تھا کہ

سبق د مدرسې وائي ، د پاره د پیسې وائي

جنت کښې به ئې ځاى نه وى، دوزخ کښې به گسې وائي

ترجمہ: سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کا مطمع نظر صرف حصول زر ہے ان لوگوں کی جنت میں کوئی جگہ نہیں ہوگی اور جہنم میں ہی رگڑے کھاتے رہیں گے۔

گاؤں کی مسجد میں قرآنی تعلیم کے حصول کے بعد باچا خان کو پشاور کے میونسپل بورڈ ہائی سکول بھیجا گیا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم وہاں سے حاصل کی اور پھر جلد ہی پشاور کے ایڈورڈ میموریل مشن ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ ریورنڈ ای ایف وگرام Rev. E. F. Wigram اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ خان عبدالغفار خان کے کم سن ذہن پر ان کا کافی گہرا اثر پڑا۔ دریں اثناء ان کے بڑے بھائی خان صاحب طبی تعلیم کے حصول کی غرض سے بمبئی چلے گئے۔ پشاور میں اب غفار خان اپنے ایک خاندانی ملازم بارانی کاکا کے ساتھ تنہا رہ گئے تھے جو ان کے سامنے ہر وقت فوجی ملازمت کے گن گایا کرتے تھے جس کا قائل ہو کر انہوں نے بھی فوج میں کمیشن کی درخواست دے دی۔ جب وہ میٹرک کر رہے تھے تو تب انہیں فوج میں اپنے کمیشن کی اطلاع موصول ہوئی اور انہیں فی الفور مردان جانے کو کہا گیا جو گائیڈز کا صدر مرکز ہوا کرتا تھا۔ خان عبدالغفار خان اپنا امتحان ادھورا چھوڑ کر چل دیے لیکن ابھی وہ فوج میں شمولیت اختیار کرنے ہی والے تھے کہ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے فوج بلکہ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بارے میں ہی ان کے خیالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ خان عبدالغفار خان بتاتے تھے کہ تقرر نامہ ملنے کے بعد وہ اپنے ایک فوجی دوست سے ملنے گئے جو ایک کیولری آفیسر تھے اور پشاور میں تعینات تھے۔ ان کے ساتھ گفتگو کے دوران وہاں ایک نو وارد نوجوان برطانوی لیفٹیننٹ کی آمد ہوئی۔ خان عبدالغفار خان کے اس دوست نے ٹوپی نہیں پہنی ہوئی تھی اور بال بھی مغربی انداز میں سنوارے ہوئے تھے۔ اس انگریز لیفٹیننٹ نے اس پر ان کا مضحکہ اڑاتے ہوئے یہ پوچھا کہ کیا وہ بھی انگریز بننا چاہتا

ہے؟ خان عبدالغفار خان کے اس دوست کو جواباً یکساں انداز میں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں ہو سکی۔ یہ سب دیکھ کر خان عبدالغفار خان نے فیصلہ کیا کہ وہ کبھی بھی فوج میں شامل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے وہ کیمبل پور (اٹک) گئے جہاں کا ایک اچھا تعلیمی ادارہ کافی مشہور تھا لیکن وہاں وہ زیادہ عرصہ نہیں رکے۔ کیمبل پور سے علی گڑھ چل دیئے۔ وہ علی گڑھ ہی میں تھے کہ انہیں اپنے والد کا خط ملا جس میں ان سے فوراً واپس آنے کو کہا گیا تھا۔ وہ خان عبدالغفار خان کو بھی انگلستان بھیجنا چاہتے تھے جہاں ان کے بھائی خان صاحب طب کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے فروری ۱۹۰۹ء سے مقیم تھے۔ ان کی روانگی کے تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے لیکن خان عبدالغفار خان کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی والدہ انہیں جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کی والدہ کا خیال تھا کہ وہ پہلے ہی ایک بیٹا کھو چکی ہیں اور دوسرے بیٹے کو جانے کی اجازت دینے پر وہ قطعی رضامند نہیں سکتیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ جو کوئی بھی بیرون ملک اور خاص طور پر انگلستان جاتا ہے تو پھر واپس کبھی نہیں پلٹتا۔ یوں خان عبدالغفار خان نے مجبور ہو کر اپنی انگلستان روانگی ملتوی کر دی اور فیصلہ کیا کہ وہ وطن میں ہی رہ کر اپنی قوم کی خدمت کریں گے جو تعلیمی لحاظ سے انتہائی پسماندہ تھی، گروہی تفرقات کا شکار تھی اور اس کے علاوہ بھی کئی قسم کی معاشرتی برائیاں پختونوں میں موجود تھیں۔ انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ پختونوں کی تعلیم، تنظیم اور اصلاح لازماً ہونی چاہئے۔

سماجی زندگی کا آغاز:

اپنی سماجی خدمات کا سلسلہ خان عبدالغفار خان نے ایک ماہر تعلیم کے طور پر شروع کیا اور اس حوالے سے وہ اس علاقے کے ایک اور سماجی مصلح حاجی فضل واحد کے کافی قریب آگئے تھے جنہیں عام طور پر حاجی صاحب آف ترنگزئی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی مشترکہ

کوششوں کی بدولت ۱۹۱۰ء میں اتمانزئی اور گندر (مردان) میں تعلیمی اداروں یعنی دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ان اداروں میں دینی تعلیم کے علاوہ طلباء میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کیا جاتا تھا۔ان تعلیمی اداروں، ان میں موجود طلباء اور معلمین کی تعداد و تنخواہوں کے بارے میں کوئی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔بعض دیگر پختون علماء اور دانش ور مثلاً مولوی فضل رابی، مولوی تاج محمد، فضل محمود مخفی اور عبدالعزیز بھی خان عبدالغفار خان اور حاجی صاحب آف ترنگزئی سے آملے تھے۔ان میں سے اکثریت دیوبندی علماء کی تھی۔خان عبدالغفار خان دیوبند کے روحانی پیشوا مولانا محمود الحسن اور ان کے چہیتے طالب علم مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ بھی رابطے میں تھے۔انہوں نے مشترکہ طور پر قبائلی علاقے میں ایک برطانیہ مخالف مرکز کے قیام کی منصوبہ بندی بھی کی تھی لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔

ادھر حاجی صاحب آف ترنگزئی نے برطانوی راج کے خلاف پرچار جاری رکھا ہوا تھا۔وہ پختونوں پر زور دے رہے تھے کہ برطانوی سامراج سے چھٹکارا پانے کے لئے ان کا ساتھ دیا جائے۔اس پر حکام زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔انہوں نے حاجی صاحب آف ترنگزئی کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن حاجی صاحب کو خفیہ طور پر حکومتی ارادوں کا علم ہو گیا۔اس سے پہلے کہ انہیں گرفتار کیا جا سکتا وہ اپریل ۱۹۱۵ء کے وسط میں قبائلی علاقے کو چلے گئے جہاں وہ اپنی وفات یعنی دسمبر ۱۹۳۷ء تک مقیم رہے۔انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ لوگوں کو برطانوی راج کے خلاف منظم کیا تھا۔ان کی ہجرت کے بعد حکومت نے ان کے مدارس بند کروا دیئے اور وہاں کے اساتذہ کی اکثریت کو قید کر لیا۔اس طرح وقتی طور پر پختون مصلحین کے قائم کردہ اس تعلیمی نظام کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

رولٹ ایکٹ اور باچا خان کی گرفتاری:

۱۹۱۹ء کے دوران ہندوستان میں کافی افراتفری رہی۔ اقتصادی صورتحال کافی ابتر ہوگئی تھی، صنعتی کارکنوں کو جن ابتر حالات میں کام کرنا پڑ رہا تھا ان کی بدولت وہ بھی مشتعل تھے، کسانوں کو روزمرہ کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی شکایت تھی۔ عالمی جنگ کے اختتام پر اتحادیوں نے ترک خلافت کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس پر مسلمان سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے جبکہ ہندوستان کے قوم پرستوں کو گلہ یہ تھا کہ جنگ میں ہندوستان کی حمایت کے حصول کے ساتھ جن وعدوں کو مشروط کیا گیا تھا ان کی تکمیل نہیں کی گئی۔ ملک میں ''انگریزی پر مبنی'' اور انقلابی سرگرمیاں روکنے کی غرض سے حکومتِ ہند نے رولٹ ایکٹ Rowlatt Act نافذ کر دیا تھا۔ جسٹس ایس اے ٹی رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے دیگر اراکین میں بی سکاٹ، سی وی کمارسوامی شاستری، ایچ وی لوویٹ اور پی سی میتر شامل تھے۔ طویل بحث کے بعد اس کمیٹی نے بعض تجاویز و سفارشات پیش کی تھیں جنہیں منظور کر کے نافذ کر دیا گیا تھا۔ یہ تجاویز ''رولٹ بلز'' کہلائی جاتی تھیں۔ قوم پرست رہنماؤں نے یہ ایکٹ مسترد کر دیا تھا۔ گاندھی جی نے اسے غیر منصفانہ، آزادی اور انصاف کے اصولوں کے منافی اور افراد کے ان بنیادی حقوق کے لئے تباہ کن ٹھہرایا تھا جس پر قوم بلکہ خود ریاست کے تحفظ کی بنیاد ہوتی ہے۔ ۱۶ اپریل کو ایک نہایت کامیاب ملک گیر ہڑتال کی گئی۔ باقی سارے ملک کی طرح صوبہ سرحد میں بھی احتجاجی مظاہرے ہوئے تھے۔ خان عبدالغفار خان نے اتمانزئی میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا تھا جس میں پچاس ہزار سے زائد افراد شریک ہوئے۔ سرحد کے دیہی علاقوں میں منعقد ہونے والا یہ پہلا سیاسی جلسہ تھا جس میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ ایک ملک گیر مسئلے پر یک جہتی کے اظہار کے لئے جمع ہوئے تھے۔ صوبائی حکام صوبہ سرحد کے

بندوبستی اضلاع میں اس قسم کی سرکار مخالف سرگرمیوں پر خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے فوراً ہی خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس کے بعد اتمانزئی گاؤں کے باشندوں پر تیس ہزار روپے کا جرمانہ بھی عائد ہوا۔ جرمانے کی ادائیگی تک ڈیڑھ سو کے قریب ممتاز شخصیات کو یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔ چھ ماہ بعد خان عبدالغفار خان رہا ہوئے اور انہیں اپنے اہلِ خانہ کے پاس جانے کی اجازت ملی۔

تحریکِ خلافت و ہجرت افغانستان:

۱۹۱۹ء کے اواخر میں ہندوستان میں خلافت تحریک آغاز ہوئی۔ صوبہ سرحد میں بھی اس تحریک کو نہایت مقبولیت اور حمایت ملی۔ مسلمانانِ ہند ترک سلطان کے ساتھ گہری مذہبی وابستگی رکھتے تھے اور وہ ان کے روحانی پیشوا یعنی خلیفہ بھی تھے۔ جنگ کے دوران اتحادیوں نے مسلمانوں کی حمایت کے حصول کے لئے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ترکی کی شکست کی صورت میں ان کے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔ تاہم جنگ جیت لینے کے بعد وہ اپنے وعدے سے پھر گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ ترکی کے ساتھ بھی دیگر مفتوح اقوام جیسا سلوک ہی کیا جائے گا۔ مسلمانانِ ہند اس پر انتہائی برانگیختہ ہو گئے تھے اور انہوں نے تحریکِ خلافت شروع کر دی تھی۔ ہجرت کی تحریک بھی تحریکِ خلافت کی ہی ایک شاخ تھی۔ علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا تھا اور مسلمانوں کو دارالسلام ہجرت کرنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اس مقصد کے لئے افغانستان انہیں اپنی محفوظ منزل معلوم ہوئی تھی کیونکہ اس ملک کے ساتھ ان کے قریبی مذہبی، ثقافتی، سیاسی اور نسلی و لسانی روابط تھے۔ وہاں کے برطانیہ مخالف امیر امان اللہ نے ہندوستانی مسلمانوں کو پناہ کی پیش کش کی ہوئی تھی۔ ساٹھ ہزار سے زائد مہاجرین کا وہاں خیر مقدم کیا گیا تھا۔ افغانستان تک رسائی میں چونکہ پشاور ایک مرکزی شہر کی حیثیت رکھتا ہے

1920ء باچا خان افغانستان جانے والے مہاجرین کی قیادت کرتے ہوئے' سفر پر روانہ ہونے سے قبل مختصر خطاب کر رہے ہیں

سانحہ قصہ خوانی ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء؛ خونین لمحوں کی تصویر، جب مادرِ وطن کی عصمت پر سینکڑوں بیٹوں نے اپنا لہو نچھاور کیا
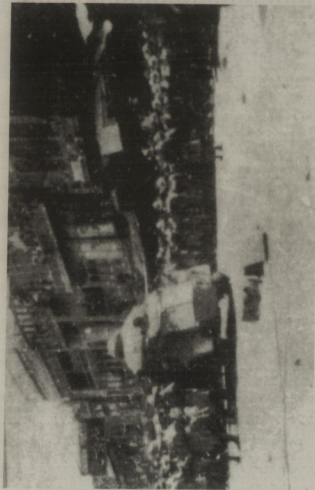
اس لئے یہ بھی متحرک سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جلد ہی پھر ہندوستان سے اس قدر بڑی تعداد میں مہاجرین افغانستان چلے گئے تھے کہ وہاں کی حکومت انہیں بوجھ محسوس کرنے لگی تھی اوران مذہبی انتہا پسندوں کے اپنے ملک میں قیام کا انتظام کرنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

دیگر پختونوں کی مانند اپنے مذہبی فریضے کی تکمیل کے لئے خان عبدالغفار خان بھی ہجرت کر کے افغانستان گئے تھے۔ وہاں چند ماہ کے قیام کے دوران ہی انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مہاجرین اور افغان حکومت کے درمیان اختلافات کا جنم لینا یقینی ہے کیونکہ مہاجرین کا انداز جارحانہ تھا اور ان میں نظم وضبط کا بھی فقدان پایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مہاجرین کے بھیس میں برطانوی جاسوسوں کی ایک بڑی تعداد میں موجودگی نے بھی صورتحال کو مزید سنگین کر دیا ہوا تھا۔ یہ مہاجرین افغان امیر سے مطالبہ کر رہے تھے کہ انگلستان کے خلاف فی الفور جہاد کا اعلان کر دینا چاہئے لیکن ایسا کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس بنیاد پر انہوں نے افغان امیر امان اللہ کی مذمت کرنا شروع کر دی تھی۔ برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کرنے کی بنیاد پر وہ انہیں غدار ٹھہرا رہے تھے۔ افغان حکام کے رویئے سے مایوس ہو کر مہاجرین نے ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ واپسی کے اس سفر میں انہیں نہایت تکالیف اور دشواریاں بھی سہنی پڑیں۔ یوں ہجرت کی یہ تحریک ناکامی پر ختم ہوئی!

انجمن اصلاح افاغنہ:

ہجرت کے تلخ تجربے کے بعد خان عبدالغفار خان اس رائے سے متفق ہوئے کہ ہندوستان چھوڑ کر جانا مسائل کا حل نہیں۔ ہجرت تحریک کے نتائج سے وہ کافی دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جا کر جہالت، ناخواندگی اور پختون معاشرے میں موجود دیگر برائیوں کے خلاف عوام کو منظم کریں گے۔ وہ جانتے تھے کہ سامراجی حکام انہیں

بندوبستی اضلاع میں فروغ تعلیم سے متعلقہ سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیں گے لہٰذا انہوں نے دیر میں خلوموکے مقام پر فضل محمود مخفی کی معاونت کے ساتھ ایک سکول شروع کیا۔ مقامی آبادی ان کی سرگرمیوں کو کافی سراہ رہی تھی اور انہوں نے اپنے بچوں کو اس سکول میں بھیجنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس سکول کی مقبولیت نے نواب آف دیر کو ہوشیار کر دیا تھا جنہوں نے مالاکنڈ کے پولیٹکل ایجنٹ کے تعاون کے ساتھ اس کے خلاف کاروائی کی ٹھان لی۔ انہوں نے خان عبد الغفار خان اور فضل محمود مخفی کو اس علاقے سے نکال کر سکول کی عمارت منہدم کرادی تھی۔

اپنی انفرادی کاوشوں کا یہ حشر دیکھنے کے بعد خان عبد الغفار خان اتمانزئی منتقل ہوئے۔ انہوں نے ہم خیال پختون سماجی کارکنوں اور دانشوروں کے ساتھ مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ انہیں اپنی تعلیمی اور سماجی بہبود کی سرگرمیاں از سرِنو مشترکہ طور پر شروع کرنی چاہئیں۔ ان صائب الرائے شخصیات میں میاں احمد شاہ، عبد اللہ شاہ، عبد الاکبر خان اکبر، میاں جعفر شاہ، محمد عباس خان، محمد اکبر خادم اور مولانا محمد اسرائیل شامل تھے۔ پختون معاشرے میں جانی دشمنیوں، منشیات کے استعمال اور تفرقات جیسی سماجی برائیوں کے قلع قمع اور جرائم کی روک تھام کے لئے بھی انہوں نے مشترکہ جدوجہد کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پختونوں میں جدید تعلیم اور پشتو زبان سے متعلق بھی آگاہی اور شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان مقاصد کے پیشِ نظر یکم اپریل ۱۹۲۱ء کو "انجمنِ اصلاح افاغنہ" کی تشکیل عمل میں آئی۔ خان عبد الغفار خان اس کے صدر اور میاں احمد شاہ اس کے سیکرٹری تھے۔ پختونوں میں باہمی اتحاد کا فروغ، سماجی برائیوں کا خاتمہ، سماجی تقریبات پر ہونے والی فضول خرچی کی روک تھام، پشتو زبان وادب کی ترویج اور پختونوں میں اسلام کے لئے "حقیقی محبت" کی تخلیق اس انجمن کے مقاصد بتائے گئے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ پختونوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا

اس انجمن کی اعلیٰ ترین ترجیحات میں شامل تھا۔اس انجمن کے قیام کے نوروز بعد یعنی ۱۰ اپریل ۱۹۲۱ء کو اتمانزئی میں آزاد اسلامیہ مدرسہ کی پہلی شاخ کھولی گئی اور پھر اس کے بعد جلد ہی پوری وادیٔ پشاور میں مختلف مقامات پر اس کی مزید شاخیں بھی کھل گئیں۔ان سکولوں کی اصل تعداد کے بارے میں کوئی یقینی معلومات دستیاب نہیں لیکن ایک محتاط مطالعہ یہ تعداد ستر کے لگ بھگ بتاتا ہے۔نصاب تعلیم میں قرآنی تعلیمات،حدیث،فقہ،اسلامی تاریخ،پشتو،ریاضی،انگریزی اور عربی کو شامل کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ بڑھئی کے کام، پارچہ سازی اور خیاطی کی تربیت کا انتظام بھی ان سکولوں میں کیا گیا تھا۔صوبے میں چونکہ اعلیٰ تعلیم کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا اس لئے طلباء کو پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام میٹرک کے امتحان کی تیاری کروائی جاتی تھی۔میاں احمد شاہ،مولانا محمد اسرائیل اور میاں معروف شاہ سمیت انجمن کے بانی اراکین مدرسے میں بلا تنخواہ تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کو ان مدرسوں کا الحاق دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ان مدرسوں کی مالی معاونت کا بنیادی ذریعہ انجمن کے اراکین کے عطیات تھے جو وہ خطیر مقدار میں ادا کیا کرتے تھے۔خان عبدالغفار خان نے اپنے بچوں کو بھی اس مدرسے میں داخل کر دیا تھا اور ان کی دیکھا دیکھی انجمن کے دیگر ارکان اور علاقے کی اہم شخصیات نے بھی اپنے بچے ان مدرسوں میں داخل کر دیئے تھے۔چونکہ ان مدرسوں میں تعلیم مفت تھی اور ہر قسم کی ذات پات اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر ان کے دروازے سبھی کے لئے کھلے رکھے گئے تھے اس لئے جلد ہی یہ عوام میں بے حد مقبول بھی ہو گئے اور ان میں زیرِ تعلیم طلباء کی تعداد ایک سو چالیس سے بڑھ کر تین سو ہو گئی تھی۔

صوبہ سرحد میں خلافت پرستی کی سیاست پر مبنی وہ عشرہ یعنی ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء تک کا دور قبائلی ایجنسیوں کی بندوق والی سیاست سے شہری، تعلیم یافتہ اور پیشہ ور سیاستدانوں کی

تقاریر اور قراردادوں کی بنیاد والی سیاست تک ارتقاء کا دور ٹھہرایا جاتا ہے۔ صوبے کے تقریباً تمام اہم شہری مراکز میں خلافت کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ تاہم مقامی مسائل کی بجائے ان میں ہمہ اسلامیاں اور ملک گیر نوعیت کے امور کی جانب توجہ دی جارہی تھی۔ صوبہ سرحد کے خلافت پرستوں کو ایک مختلف قسم کی برطانوی انتظامیہ کا سامنا تھا جو آئینی بنیادوں کی بجائے خالصتاً ذاتی بنیادوں پر چلائی جارہی تھی۔ صوبائی خلافت کمیٹیوں کو زیرِ عتاب آنے سے بچانے کے لئے مقامی قائدین نے ملک گیر سطح کی تنظیموں سے رابطہ کر کے ان کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ صوبہ سرحد میں خلافت کمیٹی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ انگریز مخالف دھڑا انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو گیا تھا جبکہ باقی سب آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

۱۹۲۱ء کے اواخر میں دھڑے بندیوں کی شکار صوبائی خلافت کمیٹی نے خان عبدالغفار خان کو پشاور آ کر کمیٹی کی صدارت پر متمکن ہونے کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ انہوں نے اس عہدے کی قبولیت کے بعد پورے صوبے کا ایک طوفانی دورہ کیا اور خلافت کمیٹی کو دیہی علاقوں میں بھی متعارف کروادیا۔ اپنے اس دورے کے دوران انہوں نے متعدد تقاریر کیں اور ہر تقریر میں ان کا زور اس نکتے پر ہوتا تھا کہ جنوبی ایشیاء کو برطانیہ کے سامراجی شکنجے سے آزاد کرانا لازمی ہے۔ ان کی یہ باتیں حکومت کے لئے پریشان کن تھیں اس لئے اس نے ان کی ان "قابلِ اعتراض" سرگرمیوں کو روکنے کی ٹھانی۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۲۱ء کو خان عبدالغفار خان گرفتار کر لئے گئے اور انہیں تین سال قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس سارے عرصے کے دوران انہیں قیدِ تنہائی بھی سہنی پڑی، ان کے ہاتھ پاؤں میں بھاری زنجیریں باندھی گئی تھیں، گرد و غبار اور گند وغیرہ بھی انہیں برداشت کرنا پڑا، جوؤں کی تکلیف الگ سے تھی، اور اس کے علاوہ بھوک بھی انہیں برداشت کرنا پڑی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں کم ترین

درجے کے سرکاری چاکروں کا اہانت آمیز رویہ اور مار پیٹ بھی سہنا پڑی تھی۔

فخرِ افغان کا خطاب' ادائیگی حج اور پختون رسالے کی اشاعت:

۱۹۲۵ء میں جب خان عبدالغفار خان کو رہائی ملی تو قید سے واپسی پر ان کا بڑا بھرپور خیر مقدم کیا گیا۔ اپنی قوم کے لئے ان کی خدمات اور قربانیوں کے پیش نظر انہیں فخرِ افغان کا خطاب ملا۔ ان کی قید ان کے مقصد یعنی پختونوں کے اتحاد کے لئے سودمند ثابت ہوئی تھی۔ جلد ہی انہوں نے ایک بار پھر صوبے کا تفصیلی دورہ شروع کیا۔ لوگ ان کی باتیں توجہ سے سنا کرتے تھے اور بڑی تعداد میں انجمن میں شمولیت اختیار کر رہے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ اپنی اہلیہ، بڑی بہن اور برادر نسبتی کے ہمراہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے روانہ ہوئے۔ اس برس سعودی عرب کے نئے فرمانروا سلطان ابن سعود نے دنیا بھر کی ممتاز مسلمان شخصیات کو مکہ آنے کی دعوت دی تھی تاکہ اسلام کو لاحق اہم مسائل اور اس کے حوالے سے غیر مسلم دنیا کے عمومی رویئے کے بارے میں بات چیت اور بحث وغیرہ کی جا سکے۔ ہندوستانی مندوبین میں دیگر افراد کے علاوہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا اسماعیل غزنوی وغیرہ شامل تھے۔ تاہم مذکورہ بحث غیر اہم معاملات پر مرکوز ہو کر بالآخر تنازعے پر منتج ہو گئی تھی۔ حجاز مقدس سے واپسی پر خان عبدالغفار خان نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں اپنے ہم خیال افراد کے ساتھ رابطے ایک بار پھر بحال کر دیئے۔ چونکہ ان دنوں اس صوبے میں کہیں بھی سیاسی یا سماجی نوعیت کا کوئی اخبار یا رسالہ موجود نہیں تھا اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ پشتو زبان میں ایک رسالے کی اشاعت شروع کی جانی چاہئے۔ ڈی جی ٹینڈولکر نے اپنی کتاب ''باچا خان (جلد اول)'' میں خان عبدالغفار خان کو یہ کہتے ہوئے بتایا ہے:

''اس وقت پختونوں کو خود اپنی ہی زبان سے کوئی محبت نہیں تھی۔ انہیں اس بات کا احساس تک

نہیں تھا کہ پختوان کی زبان ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی جاتے تو اپنی مادری زبان فراموش کر کے وہاں کی مقامی زبانیں اختیار کر لیتے تھے۔ دوسروں کو اپنی زبان سکھانے کی زحمت انہوں نے کبھی نہیں کی اور نہ ہی خود پختو میں پڑھتے لکھتے تھے! ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ تو ایک طرف، میں نے جب تعلیم یافتہ پختونوں سے اپیل کی کہ پختونوں کے لئے ایک پختو رسالے کے خریدار بن کر اسے پڑھیں تو ان کا کہنا تھا کہ پختو میں پڑھنے اور سیکھنے کے قابل کوئی چیز ہی کیا ہے؟ میرا جواب یہ تھا کہ اگر ایسا ہے تو یہ یقیناً پختو زبان کا قصور نہیں!! دنیا بھر کے ممالک کی زبانیں ایک وقت میں پسماندہ تھیں لیکن وہاں کے تعلیم یافتہ، باشعور اور باعزم افراد نے اپنی زبانوں کی پرورش کرتے ہوئے انہیں عظیم تر بلندیوں تک پہنچایا! کیا ہم میں سے کسی نے کبھی اپنی پختو کی پرورش یا اسے ترقی دینے کی کوئی کوشش کی ہے؟ ایسی کسی کوشش کے برعکس ملاؤں کا پراپیگنڈا یہ رہا ہے کہ پختو جہنم کی زبان ہے اور جہنم کے لوگ یہ زبان بولتے ہیں۔ پختونوں کی جہالت و سادہ لوحی کا عالم یہ تھا کہ وہ ان ملاؤں سے یہ تک نہیں پوچھ سکتے تھے کہ انہیں آخر یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئی ہیں اور خود وہ کب جہنم سے باہر آئے ہیں؟''

مئی ۱۹۲۸ء میں "پختون" نامی ایک ماہنامے کی اولین اشاعت ہوئی۔ اس میں سیاست، پختون وطن پرستی، اسلامی تاریخ، صنفی مسائل، ہندوستانی امور اور معاشرتی مسائل سے متعلق نہایت عمدگی سے تحریر کئے گئے مضامین شامل تھے۔ افغان امیر امان اللہ خان کے یورپی دورے کو بھی اس میں کافی اہمیت دی گئی تھی۔ یہ رسالہ جلد ہی کافی مقبول ہو گیا تھا۔ ابتداء میں اس کی تعداد اشاعت پانچ سو تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعداد تین ہزار سے زائد تک پہنچ گئی تھی۔ ''پختون'' کی اشاعت سب سے پہلے راولپنڈی، اس کے بعد امرتسر اور پھر بالآخر پشاور سے ہوئی۔ خان عبدالغفار خان اس کے مدیر اور محمد اکبر خادم شریک مدیر تھے۔

۱۹۳۱ء میں جب محمد اکبر خادم کا باچا خان کے ساتھ اختلاف پیدا ہوا تو شریک ادارت عبدالخالق خلیق کے سپرد کر دی گئی۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں سرفراز خان شریک مدیر بنے۔ اس رسالے کی اشاعت کئی بار رکی اور بہت دفعہ پھر سے شروع بھی کی گئی۔ ۱۹۳۰ء تک اس کی اشاعت ماہانہ ہوتی رہی۔ اس کے بعد اس پر پابندی لگ گئی۔ پھر جولائی ۱۹۳۱ء میں اس کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی لیکن ایک مختصر مدت کے بعد اسی سال دسمبر میں اس پر پھر پابندی لگا دی گئی۔ مئی ۱۹۳۸ء میں اس کی اشاعت پھر آغاز ہوئی اور اس دفعہ ایک ماہ میں یہ رسالہ تین بار چھپتا تھا۔ تاہم دسمبر ۱۹۴۰ء میں اس پر ایک بار پھر پابندی لگا دی گئی۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں یہ پھر شائع ہونا شروع ہوا لیکن اگست ۱۹۴۷ء میں اس پر پھر سے پابندی لگ گئی۔

خدائی خدمت گار تنظیم کا قیام:

۱۹۲۸ء کے اواخر میں افغانستان کے حالات و واقعات پختون قوم پرستوں اور اہل فکر و دانش طبقے کے خیالات میں تبدیلی کا سبب بنے۔ افغان امیر امان اللہ خان نے یورپ سے واپسی پر ملک کو جدید بنانے کے لئے اصلاحات کا دوسرا مرحلہ شروع کر دیا تھا۔ ان کے ہم وطنوں کو یہ تبدیلیاں پسند نہیں آئی تھیں۔ انہیں افغانستان کا جدید بنایا جانا منظور نہیں تھا لہٰذا انہوں نے افغان امیر کی تخت سے معزولی کی غرض سے ایک منظم تحریک شروع کر دی تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر امان اللہ خان بالآخر تخت چھوڑ گئے اور ایک تاجک باغی حبیب اللہ المعروف بچہ سقاؤ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ پختون امان اللہ خان کی معزولی پر برانگیختہ تھے کیونکہ انہیں افغان بحران کی پشت پر برطانوی سازش کارفرما نظر آ رہی تھی۔ انجمن اصلاح افاغنہ نے حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرے منعقد کروائے۔ افغانستان میں اپنے پختون بھائیوں کی مدد کے لئے انجمن نے ڈاکٹر خان صاحب کی زیرِ قیادت ایک طبی مشن بھجوانے کا

بھی فیصلہ کیا تھا۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں انجمن کی جانب سے خان عبدالغفار خان اور میاں جعفر شاہ کو قندھار میں مقیم امان اللہ خان سے ملاقات کے لئے بھیجا گیا تا کہ ان سے طبی مشن کے بارے میں اجازت لی جا سکے۔ تاہم ان دونوں کو افغان سرحد پار کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مجبوراً انہیں خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ اس سے قبل کہ انجمن اس ضمن میں مزید کچھ کرتی، امان اللہ خان مایوس ہو کر اٹلی چلے گئے اور وہیں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا!

میاں اکبر شاہ (۱۸۹۹ـ۱۹۹۰) انجمن کے ایک سرگرم رکن تھے۔ وہ پشاور میں اسلامیہ کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔ اپنی مادر وطن کو آزادی دلانے کی کاوشوں میں وہ سوویت روس تک کا سفر کر چکے تھے۔ انہوں نے جوان ترک، جوان افغان، جوانانِ بخارا اور جوانانِ خیوا وغیرہ جیسی غیر ہندوستانی تنظیموں کے طرز پر ایک تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی۔ خان عبدالغفار خان کو ان کا خیال پسند آیا اور انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک اجلاس کے انعقاد پر رضامندی ظاہر کی۔ یہ اجلاس یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو اتمانزئی میں منعقد ہوا اور اس میں "دزلمو جرگہ" نامی تنظیم کے قیام کا اعلان کیا گیا، اس تنظیم کا عارضی صدر دفتر اتمانزئی ہی میں قائم ہوا۔ عبدالاکبر خان اس جرگے کے صدر اور میاں احمد شاہ اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس کی رکنیت بلا امتیازِ ذات، عقیدہ و مذہب ہر پڑھے لکھے شخص کے لئے ہر قسم کے تعصب سے گریز کی شرط کے ساتھ دستیاب تھی۔ جرگے کی کاروائی پشتو زبان میں ہونا طے پائی۔ ہر ممکن ذریعے سے ہندوستان کی مکمل آزادی کی کوشش بھی اس جرگے کے مقاصد میں سے ایک تھی۔ اجلاس کے اختتام پر صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے ستر نوجوانوں نے اس نئی تنظیم کی رکنیت اختیار کی۔ شرکاء میں خان عبدالغفار خان، میاں اکبر شاہ ایڈوکیٹ (نوشہرہ)، مقصود جان ایڈوکیٹ (بنوں)، عبدالرحمان خان ایڈوکیٹ (ڈیرہ اسماعیل خان)، علی اصغر خان

خدائی خدمتگار تحریک کے منظم اور جانباز ساتھی

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے: بیرسٹر عبدالغفور آف پڑانگ' ارباب عبدالرحمٰن گلی گڑھی' پیر شہنشاہ کوہاٹ' مازاری مولانا صاحب' باچا خان' ارباب عبدالغفور خان آف تہکال' محمد افضل خان آف لتمبر' لالہ حکم چند آف کوہاٹ' محمد زرین خان آف میاں عیسٰی ۔ زمین پر بیٹھے ہوئے: یونس جان پشاور' نامعلوم' ڈاکٹر خان صاحب' میاں جعفر شاہ' سردار خان آف پڑانگ ۔ پچھلی دو قطاریں علی الترتیب: فردوس خان مانیری' صاحب کوہاٹ' بابو فضل الٰہی خالصہ' عبدالمالک فدا' خان میر ہلالی' سالار اینذر گل' سالار عبدالعزیز خان آف زیدہ' قاضی عطاء اللہ خان آف مردان' امیر نواب' جمنا داس مردان' سالار رب نواز اور عاشق شاہ باچا بہادر کلے

ایڈووکیٹ (ہزارہ)، قاضی عطاء اللہ ایڈووکیٹ (مردان) بیرسٹر میاں احمد شاہ (چارسدہ)، میاں قائم شاہ ایڈووکیٹ (چارسدہ)، نوشیروان خان ایڈووکیٹ (چارسدہ)، غلام صادق خان ایڈووکیٹ (نوشہرہ)، شیر بہادر خان ایڈووکیٹ (نوشہرہ)، صدر جرگہ خوشحال خان آف باری قب، پیر گوہر شاہ (کوہاٹ)، اتمانزئی کے آزاد مدرسے کے ہیڈ ماسٹر امیر ممتاز خان، عبدالاکبر خان عمرزئی (چارسدہ)، میاں عبداللہ شاہ (چارسدہ)، شیر محمد خان بی اے (چارسدہ)، عبدالقدوس خان بی ایس سی (چارسدہ) محمد علیم خان گنڈاپور (ڈیرہ اسماعیل خان) اور محمد اسلم خان (چارسدہ) شامل تھے۔ اس جرگے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے شرکاء کی اکثریت کا تعلق مختلف تعلیمی اور پیشہ ورانہ شعبوں سے تھا۔ یہ سب دیہی افراد تھے۔ ان میں سے بعض قانون کے شعبے سے اپنی وابستگی کی بدولت شہری مراکز میں مقیم تھے لیکن دیہات میں اپنے اہل خانہ اور عزیز و اقارب اور دوستوں وغیرہ کے ساتھ ان کے رابطے بدستور برقرار رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی خطاب یافتہ یا جاگیردار گھرانے کا نہیں تھا! اس کے بعد پختون مقاصد سے ہمدردی رکھنے والے عمر رسیدہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت سے استفادے کے لئے نومبر ۱۹۲۹ء میں خدائی خدمتگار تنظیم قائم کی گئی۔ سرفراز خان اس کے پہلے صدر تھے جبکہ حاجی گل کو سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تنظیم بہت جلد مقبول ہو گئی تھی۔ مذکورہ دونوں ہی تنظیمیں پختون قوم پرستی کے فروغ اور معاشرے سے سماجی برائیوں کے قلع قمع کے لئے کام کر رہی تھیں۔ ان کی جانب سے بار بار پختون اتحاد کی اپیلیں کی گئیں اور برطانوی سامراج سے نجات کی جدوجہد کے حوالے سے بھی وہ اپنے عزائم کا اظہار کرتی تھیں۔ ان کے قائدین ایک ہی تھے۔ جو پختون اہل فکر و دانش جو "وزلمو جرگہ" کی صفوں میں نمایاں تھے وہی خدائی خدمتگار تنظیم میں بھی پیش پیش تھے۔ مختصر سے عرصے میں انہوں نے صوبے کے ان دور دراز اور خصوصاً دیہی علاقوں

میں بھی اپنی تنظیم کا ایک جال پھیلا دیا تھا جو اس وقت تک سیاسی نوعیت کی تنظیموں میں نظرانداز ہو رہے تھے۔ خدائی خدمتگار تنظیم کی شاخوں اور ارکان کی حقیقی تعداد کے بارے میں اگرچہ کوئی یقینی معلومات دستیاب نہیں ہیں لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کے اراکین کی تعداد بارہ تا پندرہ سو تھی۔ پختون معاشرے کے مختلف طبقات اس تنظیم کے مقاصد کی اپنی اپنی تشریحات رکھتے تھے۔ پختون اہلِ فکر و دانش کے لئے یہ پختون ثقافت اور شناخت کے احیاء کی تحریک تھی۔ چھوٹے خوانین کے لئے یہ ایسی سیاسی اصلاحات کے تقاضوں کی تحریک تھی جو انہیں استصواب رائے کا حق دیتے ہوئے صوبے کے انتظام میں وسیع تر کردار فراہم کر سکتی تھی۔ اس کا اسٹیبلشمنٹ خلاف ہونا اسٹیبلشمنٹ مخالف علماء کی اکثریت کے مزاج سے عین موافق تھا۔ کسان اور دیگر غریب طبقات اسے خود پر معاشی جبر کرنے والے عناصر یعنی برطانوی سامراج، انگریز نواز نوابوں کی صورت میں موجود اس کے ایجنٹوں، خان بہادروں اور دیگر بڑے خوانین کے خلاف سمجھتے تھے۔

خدائی خدمت گار۔ تنظیمی ساخت، حلف اور سرگرمیاں:

شروع ہی سے خدائی خدمتگار تحریک کے قائدین نظم و ضبط کی پابندی پر بہت زور دیتے رہے تھے۔ وہ اپنے رضا کاروں کی تنظیم اور تربیت فوجی انداز میں کر رہے تھے۔ انہیں جرنیلوں، کرنیلوں اور کپتانوں جیسے فوجی رتبے بھی دیئے جاتے تھے۔ تنظیم میں شمولیت سے قبل اراکین کو حلف اٹھانا پڑتا تھا کہ وہ ہر قسم کے تشدد، منشیات، سازشوں، خاندانی تنازعات اور دیگر معاشرتی برائیوں سے دور رہیں گے۔ رضا کاروں کو تنظیم کی رکنیت کے حصول سے قبل چند باتوں کا حلف لینا پڑتا تھا۔ اس حلف کا اصل متن پشتو میں ہے۔ ذیل میں اس کا اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر ذیل میں بیان کیے گئے اصولوں کی پاسداری کا وعدہ کرتا ہوں۔

۱۔ خدائی خدمتگاری کے لئے میں اپنا نام پوری ایمانداری اور اخلاص کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

۲۔ اپنی قوم کی خدمت اور ملک کی آزادی کے لئے میں اپنی جان، مال اور آرام کی قربانی دینے کو تیار رہوں گا۔

۳۔ کسی بھی فرد یا جماعت کے خلاف گروہی بنیادوں پر میں کوئی دشمنی نہیں رکھوں گا اور جابروں کے خلاف جدوجہد میں مجبوروں کی مدد کروں گا۔

۴۔ میں کسی مخالف جماعت کا رکن نہیں بنوں گا اور جنگ کے دوران کوئی سیکورٹی دوں گا اور نہ ہی معذرت کروں گا!

۵۔ میں اپنے ہر افسر کے ہر قانونی حکم کی تعمیل کروں گا۔

۶۔ میں ہمیشہ عدم تشدد کے اصولوں کی پاسداری کروں گا۔

۷۔ میں تمام انسانوں کی یکساں خدمت کروں گا۔ تاہم میرا مقصد اپنے ملک اور مذہب کی آزادی کا حصول ہوگا۔

۸۔ میں اچھے اور شریفانہ کام کروں گا۔

۹۔ میرے تمام افعال و اعمال کا مقصد ریاکاری یا پھر کوئی عہدہ پانے کی بجائے صرف خدا کی خوشنودی کا حصول ہوگا۔

یہ رضا کار اپنی مخصوص وردیوں میں ملبوس ہوا کرتے تھے جو ساخت اور رنگ میں مختلف ہوتی تھیں۔ چونکہ ان رضا کاروں کی اکثریت غریب تھی اور خاص قسم کی وردیاں سلوانے کی استطاعت ان کی نہیں تھی اس لئے انہیں کہا گیا تھا کہ وہ اپنے عام کپڑوں کو

بھورے یا چاکلیٹی رنگ میں رنگوا لیں۔ یہ رنگ ارزاں قیمت پر آسانی سے دستیاب ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں سرکاری دستاویزات میں ''سرخ پوش'' پکارا جاتا تھا اور بعد میں ان کا یہی نام عوام میں بھی مقبولیت پا گیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کی انتظامیہ نے خدائی خدمتگاروں کے لئے ''سرخ پوشوں'' کا لفظ عمداً استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ وائسرائے کے مطابق ان لوگوں کو سرکاری دستاویزات میں ''خدائی خدمتگار'' یقیناً نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس سے ایسا تاثر ملنے کا خدشہ تھا کہ گویا پاکبازوں اور برگزیدہ افراد کے کسی گروہ سے نمٹنے کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سچ ہو کہ سرخ پوش تحریک بولشویکوں سے متاثر نہیں تھی لیکن نظریاتی طور پر اشتراکیت اس میں کافی حد تک موجود تھی۔ (صور) اور درانتی کی علامتوں والے بیجز کا استعمال اس کی ایک مثال ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کے لئے سرخ پوش کوئی ایسی نامناسب اصطلاح نہیں تھی بلکہ عملی طور پر اس سے اس کے استعمال کا مقصد کافی کامیابی سے پورا ہوتا تھا۔ برطانوی ہند کی حکومت نے ان سرخ پوشوں کے خلاف بڑا پراپیگنڈہ کیا تھا۔ انہیں بولشویکوں کے مترادف بلکہ روسی ایجنٹ تک ٹھہرا دیا گیا تھا اور الزام لگایا گیا تھا کہ ان کا مقصد حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لئے ملک میں طوائف الملوکی پھیلانا ہے۔ خدائی خدمتگاروں نے ان الزامات کی ہمیشہ تردید کی۔

عدم تشدد:

خدائی خدمتگاروں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے عدم تشدد کے اصولوں کو نہ صرف اپنا لیا تھا بلکہ بہت سختی سے ان پر عمل پیرا بھی تھے۔ اس تحریک میں شامل رضاکاروں کو تشدد نہ کرنے اور ہتھیار رکھنے سے گریز کی تربیت دی جاتی تھی۔ تحمل اور برداشت پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ انہیں کہا جاتا تھا کہ اگر ان کی تذلیل بھی ہو رہی ہو تو تب بھی انہیں

انتقام سے گریز کرنا چاہئے۔اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی مکی زندگی ان کے سامنے بطور مثال پیش کی جاتی تھی جنہوں نے اسلام کے ابتدائی دنوں میں کفار مکہ کے تمام تر مظالم نہایت صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کئے تھے۔انہیں یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کے پاس انتقام کا موقع موجود تھا لیکن حضور اکرم ﷺ نے سبھی مفتوحین کو معاف فرمادیا تھا۔

دیگر تمام قبائلی معاشروں کی طرح پختون معاشرہ بھی اپنے اندرونی اختلافات اور تشدد کی وجہ سے بدنام تھا۔خان عبدالغفار خان کی بنیادی توجہ اس جانب تھی کہ پختونوں کو خاص طور پر ''تربورولی'' کی بنیاد پر جاری رکھی جانے والی جانی دشمنیوں سے احتراز کی تعلیم دی جائے۔پختونوں میں اس قسم کی دشمنیاں بلاشبہ بڑے پیمانے کے جانی و مالی نقصانات پر منتج ہوتی ہیں۔اس وقت خود پختون بھی ان دشمنیوں سے اکتا چکے تھے اور اس کا کوئی حل چاہتے تھے۔انہیں یہ تعلیم بھی دی جارہی تھی کہ عدم تشدد پر عمل کر کے پختون کبھی بھی مغلوب نہیں ہو سکیں گے کیونکہ تشدد کا نتیجہ صرف مزید تشدد کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے۔سامراجی حکومت کے خلاف خدائی خدمتگاروں کی فتوحات سے جنم لینے والے احساسِ تفاخر نے انہیں بہت مقبول کردیا تھا اور لوگ بڑی تعداد میں اس تنظیم میں شامل ہونے لگے تھے۔

باچا خان اور گاندھی جی کے نظریات:

عدم تشدد اختیار کرنے کے حوالے سے خان عبدالغفار خان نے اپنے نظریات ۱۹۱۰ء کے اوائل میں ہی وضع کر لئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ حاجی صاحب ترنگزئی کی جانب سے برطانوی راج کے خلاف آغاز کی گئی مسلح جدوجہد انہیں پسند نہیں آئی تھی۔خان عبدالغفار خان جانتے تھے کہ پختون پہلے ہی سے سیاسی اور دفاعی لحاظ سے ایک حساس علاقے کے

باشندے ہونے کی بدولت کئی دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں اور ان کی جانب سے ایک مسلح مزاحمت خود ان ہی کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ وہ ہر طرح کے وسائل سے محروم ہیں اور مختلف مسائل سے دوچار ہیں۔

خان عبدالغفار خان کے سوانح نگار عدم تشدد کے حوالے سے ان کے نظریات کو مہاتما گاندھی سے ماخوذ بتانے میں غلطی پر ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اسی عدم تشدد کی ایک قسم تھی جس کا پرچار گاندھی جی باقی سارے ہندوستان میں کر رہے تھے۔ ان کا یہ استدلال یقیناً غلط ہے کیونکہ گاندھی جی کے عدم تشدد پر مبنی نظریات کا پختون ذہن پر اثر کم ہی ہوا تھا۔ صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گار تحریک کے ساتھ انضمام سے قبل کانگرس کے اراکین اس صوبے میں اس قدر کم تھے کہ کانگرس کمیٹی کی تشکیل کی شرط بھی اس تعداد سے پوری نہیں ہوتی تھی۔ بعد میں خاص طور پر جنگ کے دوران ہونے والے واقعات نے ثابت بھی کیا کہ خدائی خدمتگار گاندھی جی کے نہیں بلکہ خان عبدالغفار خان کے پیروکار تھے۔ اپنے نظریات کے پرچار کے سادہ طریقوں سے انہوں نے پختونوں کو قائل کر دیا تھا کہ ان کی اندرونی بے اتفاقی اور جانی دشمنیوں کا تدارک عدم تشدد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ان کے ایک ہم عصر سوانح نگار جے ایس برائٹ J. S. Bright بھی اس خیال سے متفق ہیں، ان کا کہنا ہے کہ

''خان عبدالغفار خان مکمل طور پر عدم تشدد کے اصولوں کے قائل تھے لیکن اس حوالے سے اپنے نظریات انہوں نے مہاتما گاندھی سے مستعار نہیں لئے تھے۔ اپنی سوچ انہوں نے بالکل کسی حق جو کی مانند آزادانہ طور پر تشکیل دی تھی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کے فلسفہ محبت پر ان کے گہرے قرآنی مطالعے کا بہت اثر تھا اسی لئے اگر ان کے ذہن میں عدم تشدد کا نظریہ وضع ہوا ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہونی چاہئے۔ خان عبدالغفار

خان اور مہاتما گاندھی میں میرے ذاتی خیال کے مطابق اول الذکر نے روحانیت کا عظیم تر مرتبہ پایا تھا۔خان عبدالغفار خان آسمانوں تک پہنچ چکے ہیں اور پنڈت صاحب فی الوقت زمین پر موجود ہیں جبکہ ستم ظریفی یہ ہے کہ مہاتما فضاؤں میں جدوجہد کررہے ہیں۔خان عبدالغفار خان شیلے Shelley (انگریزی شاعر) کی مانند آسمان سے زمین پر اترے ہیں جبکہ مہاتما گاندھی کیٹس Keats (انگریزی شاعر) کی طرح زمین سے آسمان کی طرف جارہے ہیں۔اسی لئے میں یہ نہیں سمجھ پاتا کہ خان عبدالغفار خان کو سرحدی گاندھی کیوں پکارنا چاہیے؟ شاید اس لئے کہ مہاتما اس میدان میں پہلے سے موجود تھے،روحانیت سے زیادہ جاہ طلبی انہیں مقصود تھی اور کسی طور زیادہ شہرت بھی انہیں حاصل ہوگئی تھی؟ اس کے سوا اور کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی!!! اگر ہم روحانی خواص کے مطالعے کی بنیاد پر تجزیہ کریں تو شاید مہاتما گاندھی کو ہندوستان کا غفار خان کہنا زیادہ مناسب ہوگا!!"

خدائی خدمتگار تحریک جیسی عظیم الشان مقبولیت اور کسی تحریک کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔خان عبدالغفار خان صوبے میں فرقہ وارانہ اور مذہبی ہم آہنگی پر بھی زور دیا کرتے تھے۔خدائی خدمتگار تحریک کے دروازے مذہب،عقیدے،فرقے یا نسلی ولسانی وابستگی کے امتیاز سے بالاتر ہو کر سبھی کے لئے کھلے رکھے گئے تھے اسی لئے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد بھی اس میں موجود تھی۔

خدائی خدمتگار تحریک اور کانگرس:

دسمبر ۱۹۲۹ء میں خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمتگار تحریک کے بعض دیگر ممتاز قائدین انڈین نیشنل کانگرس کے لاہور میں منعقدہ اجلاس میں شریک ہوئے۔کانگرس کے مندوبین نے اس اجلاس میں دریائے راوی کے کنارے پنڈت جواہر لال نہرو کی

قیادت میں جمع ہو کر ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمتگار تحریک کے دیگر قائدین کے دورۂ لاہور اور اس اجلاس میں شمولیت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ صوبہ سرحد کی بدحالی کی جانب ہندوستانی رائے عامہ کو متوجہ کیا جا سکے۔ کانگریسی رہنماؤں سے مل کر انہوں نے انہیں صوبہ سرحد کے حالات سے باخبر کیا اور اس ضمن میں ان کی مدد بھی چاہی۔ کانگرس کی اعلیٰ کمان نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی تکالیف کا جائزہ لینے کے لئے جلد ہی ایک کمیٹی بھیجے گی۔ کانگرس کے اراکین کا نظم وضبط اور جوش وخروش خان عبدالغفار خان کے لئے نہایت متاثر کن تھا۔ صوبہ سرحد واپسی پر خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمت گار تحریک کے دیگر قائدین نے صوبے بھر کا دورہ کر کے لوگوں کو کانگرس کے طرز پر منظم کرنا شروع کیا۔ دیہات کی سطح پر بھی جرگے قائم کر لئے گئے تھے۔ مکمل آزادی اور محصولات کی عدم ادائیگی کے حوالے سے بھی خان عبدالغفار خان کانگرس کے منصوبے سے پوری طرح متفق تھے۔

سول نافرمانی کی تحریک اور سانحہ قصہ خوانی:

مارچ ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ کانگرس نے گاندھی جی کی اس تحریک کی تائید کرنے کے بعد صوبائی کانگرس کمیٹیوں کو بھی اس تحریک میں شمولیت کی ہدایت کی۔ صوبہ سرحد میں اگرچہ کانگرس کی تنظیم ۱۹۲۲ء سے موجود تھی لیکن کمیٹی کی تشکیل کے لئے مطلوبہ اراکین دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسے پنجاب کانگرس کمیٹی کے ساتھ مدغم کر دیا گیا تھا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۳۰ء کو کانگرس کی صوبائی شاخ کے کارکن ہی سے خاص قسم کی مٹی لائے۔ یہ لوگ نمک کی تیاری کے ذریعے سرکار کی نافرمانی کر رہے تھے۔ تاہم کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ اگلا

قدم شراب کی دکانوں پر یلغار کا تھا اور اس کے لئے ۲۳ اپریل کی تاریخ چنی گئی۔ مقامی کارکنوں نے خان عبدالغفار خان سے مطلوبہ امداد طلب کی تھی جس کی فراہمی پر وہ رضامند ہو گئے تھے۔ اتمانزئی میں آزاد سکول کا سالانہ جلسہ ۱۹ اور ۲۰ اپریل کو منعقد ہوا جس میں خدائی خدمتگاروں، "دزلمو جرگے" کے اراکین اور کانگرس کی صوبائی کمیٹی کے ارکان نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ جلسے کے اختتام پر شرکاء، جن کی تعداد بارہ سو سے زائد تھی، کو کانگرس کی سول نافرمانی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ ۲۳ اپریل کی شب کانگرس کی صوبائی کمیٹی کے ممتاز ارکان کو گرفتار کر لیا گیا۔ باقی سارے صوبے اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں فساد پھیلنے سے روکنے کی غرض سے خدائی خدمتگار تحریک کے ممتاز قائدین کو بھی گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۳ اپریل کی شب کو کانگرس کے مقامی قائدین اللہ بخش برقی اور غلام ربانی سیٹھی گرفتاری سے بچ گئے تھے لیکن اگلی صبح انہوں نے اپنے آپ کو حکام کے حوالے کر دیا۔ کئی رضا کار جیل تک ان کے ہمراہ رہے۔ اس واقعے سے صورتحال کے تناؤ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور لوگ پرامن مظاہرے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ قصہ خوانی میں کانگرس اور خدائی خدمت گاروں کے غیر مسلح مظاہرین پر اندھا دھند گولیاں برسائی گئیں جس کے نتیجے میں کئی سو افراد موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت میں پنجاب میں اپریل ۱۹۱۹ء میں ہونے والے جلیانوالہ باغ کے المیے کی نظیر تھا۔ خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمت گار تحریک کے دیگر قائدین کو گرفتار کر کے تین سال قید بامشقت کی سزا سنا کر پنجاب میں گجرات جیل بھیج دیا گیا۔ قصہ خوانی بازار میں ہونے والے اس قتلِ عام کے بعد پشاور میں ۳۱ مئی کو نہتے لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کا ایسا ہی ایک اور واقعہ رونما ہوا جس میں بارہ افراد شہید ہوئے۔ ۱۶ مئی کو فوجیوں نے اتمانزئی پر حملہ بولا، ۲۸ مئی کو مردان

کے ایک گاؤں تکر پر چڑھائی کی گئی۔ان واقعات میں خدائی خدمتگاروں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔۲۴ اگست کو ہاتھی خیل کے مقام پر جمع ہونے والے پرامن مظاہرین پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی جس میں ستر افراد موقع پر ہی شہید ہو گئے۔خدائی خدمت گار تحریک، وزلمو جرگہ، کانگرس کی صوبائی کمیٹی اور نوجوان بھارت سبھا کی سرحد شاخ پر فی الفور پابندی عائد کر دی گئی تھی۔۱۶ اگست کو صوبے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور یوں باقی سارے برصغیر سے یہ علاقہ اس وقت کٹ کر رہ گیا۔صوبے کے اندر اور باہر آمد و رفت اور نقل و حمل کی تمام سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور ہر قسم کے پیغامات سختی سے سنسر کئے جا رہے تھے۔عدم تشدد کے قائل غیر مسلح خدائی خدمت گاروں پر فائرنگ اور لاٹھی چارج ایک معمول بن گئے تھے۔انہیں مارپیٹ کا نشانہ بنانے کے علاوہ بے لباس کر کے پھرایا بھی جاتا تھا اور جب یہ لوگ ایسی حالت میں چل رہے ہوتے تھے تو ان کے اردگرد موجود فوجی اپنی رائفلوں کے بٹوں اور سنگینوں کی نوکوں سے انہیں مارتے رہتے۔انہیں سرعام اس وحشیانہ سلوک کا نشانہ بنانے کا بعد قریب ہی کسی گندے نالے میں پھینک دیا جاتا تھا۔انتہائی حد کی بدسلوکی ان خدائی خدمتگاروں کے ساتھ روا رکھی گئی تھی۔پہلے اگر کبھی پختونوں کے ساتھ ایسا ہوتا تو موقع ملنے پر وہ اس کا بدلہ بھی یقیناً لے لیتے لیکن اب انہیں صبر اور تحمل کے ساتھ تذلیل اور جبر برداشت کرنے اور انتقام سے گریز کی تعلیم دی جا رہی تھی۔یہ خدائی خدمتگار خان عبدالغفار خان کی پیروی کر رہے تھے اور حکومتی جبر کے خلاف انہوں نے کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔عدم تشدد کے قائل ان غیر مسلح خدائی خدمت گاروں پر حکومتی ظلم و ستم کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی تحریک میں صوبے کے زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہونے لگے۔۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء سے قبل خدائی خدمتگاروں کی تعداد بارہ سو تھی لیکن

حکومتی مظالم کے بعد چند مہینوں کے اندر اندر یہ تعداد چوبیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

مسلم رہنماؤں کا مدد سے انکار:

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ خان عبدالغفار خان گجرات جیل بھیجے گئے تھے۔ دو ممتاز خدائی خدمتگار یعنی میاں جعفر شاہ اور عبداللہ شاہ ابھی تک جیل سے باہر تھے۔ وہ خفیہ طور پر جیل میں داخل ہوئے اور وہاں انہوں نے خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمتگاروں کے دیگر قائدین کے ساتھ ملاقات کر کے انہیں صوبے میں حکومتی مظالم سے باخبر کیا۔ انہوں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ حکومت بولشویکوں کے ساتھ ان کے تعلقات ثابت کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہے۔ مزید حکومتی مظالم کی زد میں آنے سے بچنے کے لئے ملک گیر سطح کی کسی سیاسی جماعت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا جائے۔ میاں جعفر شاہ تحریک خلافت کے دنوں سے پنجاب کے بعض لوگوں کے ساتھ رابطے میں تھے۔ انہوں نے گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے خلافت کمیٹی کے ممتاز کارکن ملک لال خان سے ملاقات کی۔ ان کے ذریعے وہ پھر سر فضل حسین سے بھی ملے جو پنجاب میں یونین ازم کے مرد آہن اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی تھے۔ تاہم خدائی خدمتگاروں کو یہ دیکھ کر نہایت مایوسی ہوئی کہ ان میں سے کوئی بھی برطانوی حکومت کے خلاف ان کی مدد کو تیار نہیں تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس ان کا اگلا انتخاب تھا۔ چونکہ کانگرس والے پہلے ہی سے انگریز حکومت کے خلاف صف آراء تھے اس لئے انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف اس جنگ میں اپنی صفوں میں خدائی خدمتگاروں کا فی الفور خیر مقدم کیا۔

رہائی اور کانگرس سے باقاعدہ وابستگی:

۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو انگریز حکومت اور کانگرس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے

"گاندھی اروِن معاہدہ" کہا جاتا ہے۔اس معاہدے کے تحت کانگرس کے گرفتار قائدین رہا کردیئے گئے اور حکومت سول نافرمانی کے دنوں میں اپنے جاری کردہ آرڈیننسوں کو واپس لینے پر بھی رضامند ہوگئی۔کانگرس نے بھی سول نافرمانی اور برطانوی مصنوعات کے بائیکاٹ کی تحریک کے خاتمے پر رضامندی ظاہر کردی تھی۔اس معاہدے کے تحت ۱۱ مارچ کو خان عبدالغفار خان اور دیگر خدائی خدمتگار قائدین رہا کردیئے گئے۔اپنی رہائی کے فوراً بعد خان عبدالغفار خان صوبہ سرحد چلے گئے جہاں انہوں نے خدائی خدمت گاروں کی تنظیم کا کام دوبارہ شروع کردیا۔مذکورہ معاہدے کو وہ ایک عارضی جنگ بندی قرار دے رہے تھے اور انہوں نے خدائی خدمتگاروں کو ایک اور مقابلے کے لئے تیار ہونے کا کہہ دیا تھا۔انہوں نے کئی عوامی جلسوں سے خطاب بھی کیا۔وہ اپنے لوگوں کو بتاتے تھے کہ "فرنگیوں کا ایک سینگ پہلے ہی سے توڑا جا چکا ہے۔اب آپ لوگ اٹھ کھڑے ہو کر دوسرا سینگ توڑنے کی تیاری کریں!! یہ آپ لوگوں کا وطن ہے جو خدا نے آپ کے نصیب میں لکھ رکھا ہے لیکن بدقسمتی سے آپ لوگوں کی اس سرزمین پر فرنگیوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔آپ کے بچے بھوک اور پیاس سے مر رہے ہیں جبکہ ان کے بچے ہر نعمت سے مستفید ہو رہے ہیں"

دریں اثنا خدائی خدمتگاروں کو کانگرس کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے کراچی آنے کی دعوت دی گئی۔خان عبدالغفار خان اور تقریباً ستر کی تعداد میں دیگر ممتاز خدائی خدمتگار ۲۷ مارچ ۱۹۳۱ء کو کراچی پہنچے۔۳۰ مارچ کو خان عبدالغفار خان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ کانگرس سے اپنی وابستگی کا سرعام اعلان کردیں جو انہوں نے اشارتاً پورا کردیا۔۱۹ اگست کو "وزلمو جرگہ" اور خدائی خدمتگار تحریک بھی اپنی الگ شناخت کی شرط پر کانگرس کا حصہ بنادی گئی۔خان عبدالغفار خان مشترکہ طور پر ان کے صوبائی سربراہ مقرر کئے گئے اور یوں شہری اور

دیبی کانگرس کے درمیان باہمی اختلافات کے سلسلے کا خاتمہ ہو گیا۔

میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان اکبر اور محمد اکبر خادم سمیت خان عبدالغفار خان کے بعض ساتھی ان پر یہ الزام لگا رہے تھے کہ انہوں نے خدائی خدمتگار تحریک ہندوؤں کے زیر اثر رہنے والی کانگرس میں مدغم کر دی ہے۔ یہ لوگ اس لئے برانگیختہ تھے کہ انہیں لگ رہا تھا کہ کانگرس کے ساتھ ادغام کی بدولت خدائی خدمت گار تحریک کی اپنی الگ شناخت باقی نہیں رہے گی۔ خان عبدالغفار خان نے اپنے ان ساتھیوں کو بتایا کہ ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ پختونوں کو صوبائی حدود سے باہر امداد اور تعاون درکار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کانگرس کے ساتھ انضمام سے خدائی خدمت گار تحریک کے مفادات کو قطعی کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو حضور اکرم ﷺ کی زندگی سے بھی مثالیں دیں جنہوں نے مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے پیش نظر یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی معاہدے کئے تھے۔ خدائی خدمتگاروں کو کانگرس میں شمولیت کے بعد ملک گیر سطح پر مقبولیت حاصل ہو گئی تھی اور وہ منجدھار کی سیاست کا حصہ بن گئے تھے۔ اس انضمام کے ذریعے کانگرس کو بھی ایک مسلمان اکثریتی صوبے کی حمایت حاصل ہو گئی تھی اور یہ امر خاص طور پر اس کے لئے اس وجہ سے بھی سود مند تھا کہ اب مسلم لیگ کے اس الزام کی تردید اس کے لئے مزید آسان ہو گئی تھی کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی سیاسی جماعت ہے۔

قید و بند، علاقہ بدری اور سیاسی سرگرمیاں:

ماہ دسمبر میں گاندھی جی اور برطانوی حکومت کے درمیان دوسری گول میز کانفرنس ناکام ہو جانے کے بعد خدائی خدمت گاروں کے خلاف ایک عمومی کریک ڈاؤن شروع ہوا۔ ۲۴ دسمبر کی رات خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب اور دیگر ممتاز خدائی خدمتگار

گرفتار کر لئے گئے۔ چھ ماہ تک خان عبدالغفار خان قید تنہائی میں رہے۔ ۲۷ اگست ۱۹۳۴ء کو تین سال قید بامشقت گزارنے کے بعد انہیں اپنے بھائی سمیت رہائی ملی لیکن پنجاب اور سرحد میں ان کے داخلے پر ہنوز پابندی تھی۔ گاندھی جی نے اس پابندی کے خاتمے تک انہیں اپنے پاس واردھا میں رہائش کی دعوت دی۔ اپنی رہائی کے ٹھیک ایک دن بعد ۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کو خان عبدالغفار خان ایک بار پھر گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر حکومت کے خلاف عوام کو اکسانے کا الزام تھا۔ دو برس قید بامشقت کی سزا انہیں سنائی گئی۔ بالآخر یکم اگست ۱۹۳۵ء کو انہیں آزادی ملی لیکن اس بار بھی ان پر یہ پابندی لگائی گئی تھی کہ وہ ۲۹ نومبر تک پنجاب اور سرحد میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ تاہم اگست کے آخری ہفتے میں انہیں صوبہ سرحد میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ ان کے وہاں پہنچنے تک ہندوستان کے سیاسی منظر پر انتہائی نوعیت کی تبدیلیاں ظاہر ہو چکی تھیں۔ اختلافی سیاست کی جگہ پارلیمانی سیاست نے لے لی تھی اور کانگرس اس نئے نظام میں بڑے بھرپور طریقے سے حصہ لے رہی تھی۔ اگرچہ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء بھی صوبہ سرحد میں کانگرس کی حکومت رہی لیکن خان عبدالغفار خان نے خود کو کسی قسم کی وزارتی ذمہ داری سے الگ رکھتے ہوئے تمام تر توجہ خدائی خدمت گار تحریک کی تنظیم پر مرکوز کی ہوئی تھی۔ ایک اہم خاصیت ان کے دوروں کی یہ تھی کہ ان میں تعمیراتی سرگرمیوں کی اشاعت و ترویج بڑے زور و شور سے کی جا رہی تھی۔

دوسری جنگ عظیم اور باچا خان کا فلسفہ عدم تشدد:

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا اور اپنی نوآبادیوں کو بھی اس میں شریک ہونے کی اس نے ہدایت کی تھی۔ ان نوآبادیوں کی جانب سے بھی جنگ سے متعلقہ فیصلوں کی تائید ہوئی۔ ہندوستان کے

وائسرائے نے ہندوستانی عوام کو اعتماد میں لئے بغیر یہ اعلان کر دیا کہ ہند بھی جرمنی سے بر سرپیکار ہے۔اس موقع پر کانگرس نے جنگ کے لئے اپنی حمایت بعض آئینی رعایات کی فراہمی سے مشروط کر دی تھی لیکن برطانوی حکومت نے ان کے مطالبات مسترد کرتے ہوئے ان سے جنگ کے لئے غیر مشروط حمایت کا تقاضا کیا جو کانگرس نے رد کر دیا۔۲۲ ستمبر کو کانگرس کی اعلیٰ کمان نے اپنی صوبائی وزارتوں سے مستعفی ہو جانے کو کہا۔سرحد کی کانگرس حکومت ۷ نومبر کو مستعفی ہوئی۔خدائی خدمتگار اس امر پر خوش تھے کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب ان کی اصلاحی سیاست کی راہ میں حائل ہو کر ان کے مفادات کے لئے نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں۔

ہندوستان کے دیگر صوبوں کے برعکس صوبہ سرحد میں نسبتاً خاموشی چھائی ہوئی تھی۔شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہاں کے لوگ دور افتادہ علاقوں میں جاری جنگ میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ایک محدود پیمانے پر صوبائی کانگرس حکام کے خلاف صف آراء تھی۔ستمبر ۱۹۳۹ء میں کانگرس کی جانب سے برطانیہ کی جنگی مساعی کے لئے مشروط حمایت کے حوالے سے پونا پیش کش کی بدولت خود اس جماعت کی اندرونی صفوں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔خان عبدالغفار خان اس وقت کانگرس کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔وہ بھی کانگرس کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔انہوں نے عدم تشدد کا حلف اٹھایا تھا اور خدائی خدمتگار تحریک کا ایک بنیادی مقصد تمام انسانیت کی یکساں خدمت کرنا بھی تھا۔ان کا کہنا تھا کہ "ہم ہمیشہ جنگ اور اس سے متعلقہ تباہ کاریوں کی مذمت کرتے آئے ہیں اور یہی وقت ہے کہ ہم اپنے مقاصد کے لئے اپنے اخلاص کا ثبوت دیتے ہوئے جنگ کی ہر ترغیب کی مزاحمت کریں!!" کانگرس کے مذکورہ فیصلے کی بدولت انہوں نے اس جماعت کی مرکزی

ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔ایک خط کے ذریعے گاندھی جی کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا" کانگرس کی بعض حالیہ قراردادوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا عدم تشدد کے نظریئے کو صرف سامراج سے آزادی پانے کے لئے ہندوستان کی جدوجہد تک محدود رکھا جا رہا ہے۔یہ طرزِعمل مستقبل میں کس حد تک اور کس کس طرح سے اپنایا جائے گا؟ اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا! شاید مستقبل قریب کے حالات اس بارے میں کچھ روشنی ڈال سکیں گے۔فی الحال میرے لئے کانگرس کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کے رکن کے طور پر کام کرنا ممکن نہیں لہٰذا میں اس کی رکنیت سے مستعفی ہو رہا ہوں۔میں یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ عدم تشدد کے جس نظریئے کا پرچار میں اپنے خدائی خدمت گار بھائیوں کو کرتا رہا ہوں وہ بہت وسیع ہے۔ہماری زندگیوں پر اس کا اثر ہے اور یہ ایک مستقل قدر رکھتا ہے۔عدم تشدد کے نظریات کو پوری طرح سے اپنائے بغیر ہم خاندانی دشمنیوں کی اس لعنت سے چھٹکارا نہیں پا سکتے جو ایک عرصے سے یہاں کے عوام کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔جب سے ہم نے عدم تشدد کے اصول اپنائے ہیں اور خدائی خدمت گاروں نے اس کا حلف لیا ہے تو تب سے ہم اس معاشرتی برائی کو ختم کرنے میں زیادہ تر کامیاب رہے ہیں۔عدم تشدد نے پختونوں کے حوصلے میں مزید اضافہ کیا ہے۔ہمارے لوگ چونکہ اس سے قبل تشدد کے سخت عادی تھے اس لئے عدم تشدد کا سب سے زیادہ فائدہ بھی انہی کو پہنچا ہے۔اس کے بغیر اپنا موثر دفاع ہمارے لئے کبھی ممکن نہیں ہو سکے گا۔اسی لئے خدائی خدمت گاروں کے لئے لازمی ہے کہ وہ وہی بنیں جس کا اظہار ان کے نام سے ہوتا ہے یعنی صرف خدا کے نام پر انسانیت کے سچے خادم! ایسے خادم جو کسی اور کی جان لینے کی بجائے اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں!!" خان عبدالغفار خان کی اہنسا کے بارے میں گاندھی جی کہتے تھے کہ

"جس طوفان نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس میں خان صاحب عبدالغفار خان کسی چٹان کی مانند مستحکم رہے تھے۔ وہ ایک پختون تھے اور پختونوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رائفل یا تلوار ہاتھ میں لئے اس دنیا میں آتے ہیں لیکن خان صاحب نے اپنے خدائی خدمتگاروں کو رضا کارانہ طور پر ہر قسم کے ہتھیار پھینک کر رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ میں شامل ہونے کو کہا تھا۔ انہوں نے خود دیکھا کہ ہتھیار پھینک دینے کا ان کے لوگوں پر جادوئی اثر ہوا تھا۔ نسل در نسل چلنے والی جانی دشمنیاں جو پختونوں کی عام زندگی کا ایک معمول بن گئی تھیں ان سے چھٹکارے کا واحد طریقہ یہی تھا۔ ان دشمنیوں کی بدولت پورے پورے خاندان تباہ ہو جایا کرتے تھے۔ خان صاحب کو ایسے میں عدم تشدد ہی اس صورتحال سے نجات کا واحد ذریعہ نظر آیا۔ اس کے بغیر یہ جانی دشمنیاں بلا اختتام یوں ہی جاری رہتیں اور عین ممکن تھا کہ پختونوں کے خاتمے کا سبب بن جاتیں۔ انہوں نے یہ بات واضح طور پر سمجھ لی تھی کہ اگر کسی طور پختونوں کو انہوں نے بدلہ نہ لینے پر قائل کر لیا تو نہ صرف یہ تباہ کن جانی دشنیاں ختم ہو جائیں گی بلکہ پختونوں کی شجاعت بھی ایک بہتر انداز میں ظاہر ہو سکے گی۔ ان کے لوگوں نے ان کا پیغام پوری طرح سے قبول کیا اور عملی طور پر انہوں نے بہادروں جیسا عدم تشدد کا نظریہ ثابت بھی کر دکھایا۔ اپنے اور اپنے خدائی خدمتگاروں کے نظریات ان پر پوری طرح واضح تھے اسی لئے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی سے ان کا استعفیٰ لازمی تھا۔ اس کمیٹی کی رکنیت پر ان کا برقرار رہنا ایک بڑی عجیب بات ہوتی بلکہ یہ ان کی زندگی بھر کی جدوجہد کے خاتمے کے مترادف ہوتا۔ ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک طرف تو اپنے لوگوں کو بدلے جیسے قبائلی رواج ترک کرنے کی تلقین کریں اور دوسری طرف انہیں فوج میں شمولیت کا کہیں! عام پختون اس پر یقیناً ان سے بحث کرتے اور ان کی دلیل یہ ہوتی کہ یہ جنگ بھی بدلے اور انتقام کی ہے اور نوعیت

میں ان کی جانی دشمنیوں سے مختلف قطعاً نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ خان صاحب اپنے پیغام کو اپنے لوگوں تک پہنچانے میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں لیکن یہ مجھے علم ہے کہ ان کے لئے عدم تشدد اور آہنسا کوئی دانش ورانہ نظریات نہیں بلکہ شہودی عقائد کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ غیر متزلزل بھی ہیں۔ اپنے پیروکاروں کے بارے میں وہ نہیں جانتے کہ وہ کس حد تک ان عقائد کی پیروی کریں گے لیکن انہیں اس کی کوئی فکر بھی نہیں۔ انہیں بس اپنا فرض نبھانا ہے جو اپنی قوم کے حوالے سے ان کی ذمہ داری ہے۔ نتائج وہ خدا پر چھوڑے ہوئے ہیں۔ اپنے آہنسا کے نظریات انہوں نے قرآن سے لئے ہیں۔"

باچا خان کا کانگرس سے استعفیٰ:

۸ جولائی کو خان عبدالغفار خان نے کانگرس کی ہائی کمان کو بھی اپنے مستعفی ہونے کی اطلاع دی۔ اپنے اس استعفے کے ذریعے انہوں نے خود کو عدم تشدد کا بھرپور حامی ثابت کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس بات کا ثبوت بھی دیا کہ وہ ایک با اصول انسان ہیں اور اصولوں کی بات آئے تو اس ضمن میں انہیں گاندھی جی کی بھی اندھی تقلید قبول نہیں۔ اسی قسم کے مواقع پر یہ ثابت ہوتا تھا کہ خدائی خدمت گار تحریک ایک علیحدہ تنظیم ہے اور برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں یہ کانگرس کی محض معاونت کر رہی ہے۔ خان عبدالغفار خان کے اس فیصلے کی سبھی خدائی خدمت گاروں اور سرحد میں ان کے دیگر ہم خیال افراد نے تائید کی تھی۔

کانگرس کے مؤقف میں تبدیلی کے بعد استعفے کی واپسی:

تاہم رام گڑھ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بذریعہ ایک قرارداد بڑے واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ کانگرس کسی بھی صورت میں برطانیہ کے جنگی منصوبوں کی حمایت

نہیں کرے گی۔اس قرارداد کے بعد خان عبدالغفار خان ایک بار پھر کانگرس میں شامل ہوگئے۔انہیں فوراً ہی مرکزی تنظیم کی جانب سے صوبہ سرحد میں کانگرس کی ستیہ گرہ تحریک کی رہنمائی کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔انہوں نے اس غرض سے صوبے کا ایک طوفانی دورہ کیا اور مختلف علاقوں میں انہوں نے تربیتی کیمپوں کے قیام کے علاوہ رضا کاروں کے ناموں کا اندراج کروایا۔ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سرحد کے عوام کو برطانیہ کی جنگی کاوشوں سے دور رہنے کی تعلیم دی جائے اور مسئلہ ہند کے حل تک برطانوی ہند کی فوج میں شمولیت سے احتراز کیا جائے۔۸اگست کو بمبئی میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی قرارداد منظور ہونے کے بعد کانگرس نے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔۹اگست کو گاندھی جی سمیت کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے کئی ارکان گرفتار کر لئے گئے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی سینٹرل ورکنگ کمیٹی اور پراونشل کانگریس کمیٹیوں کو غیر قانونی ٹھہرا دیا گیا۔ممتاز رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد ملک بھر میں بدامنی پھیل گئی تھی۔آتش زنی،لوٹ مار اور سبوتاژ کی کاروائیوں کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔کانگرس کے کارکنوں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع ہوگیا تھا۔

صوبہ سرحد میں تحریک کے آغاز پر صورتحال بظاہر پرامن اور حکام کے کنٹرول میں تھی۔مقامی کانگرسیوں کی جانب سے بدامنی اور فساد پر منتج ہونے والی بعض کاروائیوں کے باوجود حکام ان کے خلاف طاقت کے استعمال سے گریز کر رہے تھے۔سر جارج کننگھم Sir George Cunningham کو یہ قوی یقین تھا کہ خدائی خدمتگاروں کے ساتھ سخت رویہ صورتحال کو مزید ابتر کر دے گا۔بدامنی پھیلانے والے عناصر سے آہنی ہاتھ کے ساتھ نمٹنے کی مرکزی حکومت کی پالیسی اپنانے سے وہ گریز کر رہے تھے۔تاہم وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ صوبائی حکام کو اپنی پرانی پالیسی کی طرف ہی واپس پلٹنا پڑا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں کانگرس کے رضا کاروں پر انتہائی بے رحمانہ لاٹھی چارج کیا گیا اور ان کے منعقد کردہ احتجاجی مظاہرے پر گولی چلائی گئی۔ خان عبدالغفار خان تک کو اس قدر بے رحمی سے پیٹا گیا تھا کہ ان کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ ۱۲۷ کتوبر کو انہیں مردان کے ایک مضافاتی علاقے میر ویس ڈھیری سے گرفتار کرلیا گیا۔

۱۹۴۵ء کے ابتدائی مہینوں میں جنگی صورتحال میں قدرے بہتری آئی۔ خیر سگالی کے جذبات کے اظہار کے طور پر کانگرس کے اسیر قائدین رہا کر دیئے گئے۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں اپنی رہائی کے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر خان صاحب، نے صوبے میں سردار اورنگزیب خان کی قیادت میں قائم مسلم لیگی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی۔ پھر سردار اورنگزیب خان اور ان کے ساتھی مستعفی ہو گئے۔ ۱۶ مارچ کو گورنر سرحد نے ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت کی تشکیل کی دعوت دی۔ ان کی حکومت کے اولین اقدامات میں سے ایک خان عبدالغفار خان اور دیگر خدائی خدمت گاروں کی فی الفور قید سے رہائی کا فرمان تھا۔ یہ سب ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک میں شمولیت کے وقت سے پابند سلاسل رکھے گئے تھے۔

وزارتی مشن اور باچا خان:

ملک گیر سطح پر حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد ہندوستان کے مسئلے کے حل کے لئے ایک وزارتی مشن بھیجا گیا تھا۔ یہ مشن ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا اور فوراً ہی اس نے اہم سیاسی تنظیموں کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ آغاز کر دیا تھا۔ سیاسی جماعتوں کے ساتھ ہونے والے یہ مذاکرات انتہائی ناکام رہے کیونکہ تمام سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کی سخت مخالف تھیں۔ ۱۶ مئی کو اس کمیشن نے خود اپنی سفارشات پیش

کیس جو اس کی نظر میں ہندوستان کے مسئلے کے حل کا بہترین انتظام تھا۔ ان مجوزہ سفارشات میں دفاع، امور خارجہ اور کرنسی کا شعبہ مرکزی حکومت کے حوالے کیا گیا تھا جبکہ بقیہ تمام اختیارات صوبوں کو تفویض کر دیئے گئے تھے۔ ملک کے تمام صوبوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے گروہ میں بہار، بمبئی، سی پی، مدراس، اڑیسہ اور یو پی شامل تھے جو تمام ہندو اکثریتی علاقے تھے۔ دوسرے گروہ میں شمالی مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور سندھ شامل کئے گئے تھے جو مسلمانوں کی اکثریت والے علاقے تھے۔ تیسرا گروہ آسام اور بنگال پر مشتمل تھا۔ سرحد کی صوبائی کانگرس صوبوں کی اس گروپ بندی سے مطمئن نہیں تھی کیونکہ ان کے لئے یہ مستقلاً پنجاب کی زیر تسلط رہنے کے مترادف تھا۔ اس وقت تک وہ کانگرس کے مطالبات کے مطابق آزاد اور متحد بھارت کے حامی تھے۔ تاہم بدلتے ہوئے حالات میں وہ ہندوستان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری کا تقاضا کر رہے تھے تاکہ کسی بھی بیرونی حلقے کی مداخلت کے بغیر اپنے معاملات کی نگرانی خود کر سکیں۔ صوبائی کانگرس قبائلی علاقہ جات کو بھی بندوبستی اضلاع کے ساتھ ضم کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی کیونکہ دونوں علاقوں کے لوگ ویسے بھی مشترکہ نسلی، لسانی، مذہبی اور ثقافتی جڑیں رکھتے ہیں اور ان کے درمیان خطِ تفریق سامراجی قوتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کی غرض سے برسوں پہلے کھینچی تھی۔ خان عبدالغفار خان بھی صوبوں کی گروپ بندی کے خلاف تھے کیونکہ اس طرح انہیں پنجاب کے ساتھ شامل ہونا پڑتا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے نہایت صاف الفاظ میں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ پختون سینکڑوں میل دور واقع ہندو اکثریتی صوبوں میں بھی شامل نہیں ہونا چاہیں گے۔ خان عبدالغفار خان کا کہنا تھا کہ سرحد کے کانگرسی مسلمان گروپ بی میں شمولیت پر اس صورت میں راضی ہوں گے اگر پنجاب خدائی خدمتگاروں کے ساتھ رویئے کے حوالے سے

کوئی ضمانت دے۔ ان کو برصغیر کے مستقبل کے سیاسی ڈھانچے میں پختونوں کے لئے ایک با وقار اور محترم مقام کے حصول کی خواہش تھی۔

فرقہ وارانہ فسادات:

اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتہ کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے جو جلد ہی نواکھلی، بہار اور یوپی کے کئی دیگر حصوں تک پھیل گئے۔ حکام ان فسادات پر قابو پانے میں ناکام رہے تھے۔ ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے۔ اس قتلِ عام نے برصغیر میں ہندو مسلم اتحاد کی تمام امیدیں خاک میں ملا دی تھیں۔ صوبہ سرحد میں بھی یہ فسادات مسلم لیگ کے حامی مسلمانوں کے نظریات کی تبدیلی کا سبب بنے۔ اس سے قبل وہ پہلے خود کو پختون اور بعد میں مسلمان قرار دیتے تھے لیکن اب ان کی سوچ بدل گئی تھی۔ ایک وسیع تر مسلم برادری کے ساتھ وابستگی کا احساس ان میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سرحد کی مسلم لیگ نے فسادات سے متاثرہ علاقوں میں لوگوں کے قتلِ عام سے متعلق معلومات کے حصول اور چھان بین کے لئے اپنی ٹیمیں بھیجیں۔ یہ ٹیمیں جنسی زیادتیوں، تشدد، قتل و غارت گری اور مساجد اور قرآن کریم کی بے حرمتی کی داستانوں کے ساتھ واپس لوٹی تھیں۔ مسلم لیگ کی صوبائی شاخ نے چند مہینوں کے اندر اندر وہ کامیابیاں حاصل کر لی تھیں جو بصورت دیگر اسے برسوں میں بھی نہیں مل سکتی تھیں۔

مقننہ کے ذریعے اندرونی طور پر کوئی تبدیلی لانا ممکن نہیں تھا کیونکہ ایوان کے کل پچاس میں سے تینتیس اراکین کانگرس اور اس کے حامیوں پر مشتمل تھے اور مسلم لیگ کے پارٹی پروگرام کو ان کی نظر میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ سرحد مسلم لیگ نے کانگرس کی صوبائی حکومت کے خاتمے کے غیر آئینی حربے آزمانا شروع کر دیئے۔ پاکستان کے قیام کے لئے ایک منظم تحریک شروع کر دی گئی تھی جس کے ذریعے ایک الگ وطن کے قیام کو ہندو مسلم

مسئلے کا واحد حل پیش کیا جا رہا تھا۔ مسلم لیگ کی صوبائی شاخ نے ڈاکٹر خان صاحب کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک بھی شروع کر دی تھی۔ شاید یہ لوگ بتانا چاہ رہے تھے کہ صوبے کی مسلمان آبادی مسلم لیگ کے پاکستان مطالبے کی حمایت کرتی ہے۔ کانگرس کی وزارت کے خلاف مسلم لیگ کی سرحد شاخ کی سول نافرمانی پر مبنی سرگرمیوں کا تفصیلی بیان زیر نظر مقالے کے اہداف میں شامل نہیں۔ یہاں بات خان عبدالغفار خان کی سرگرمیوں تک محدود رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ وہ اس وقت بنگال اور بہار کے فساد سے متاثرہ علاقوں کا دورہ کر کے وہاں کے عوام میں اعتماد کی بحالی کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے متاثرہ افراد کو از سرِ نو اپنی زندگی شروع کرنے میں مدد دینے کے لئے ایک غیر سیاسی کمیٹی کی تشکیل کی تجویز بھی دی تھی۔ ان فرقہ وارانہ فسادات کی بدولت ہونے والی تباہ کاریوں کا انہیں شدید افسوس تھا۔ بہار میں اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "کہ ہندوستان آج بالکل کسی دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے اور میرا دل یہ دیکھ کر روتا ہے کہ ہم نے اپنے گھروں کو خود ہی نذرِ آتش کیا ہے۔ اپنے وطن میں ہر طرف مجھے تاریکی کی حکمرانی نظر آتی ہے اور میری نگاہیں روشنی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں۔" انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "ہندوستان مسلمانوں اور ہندوؤں پر مبنی ایک واحد قوم ہے۔ یہاں ایسے صوبے موجود ہیں جہاں ہندو اقلیت میں ہیں اور اس کے علاوہ مسلمان اقلیت والے صوبے بھی موجود ہیں۔ اگر دیگر علاقوں میں بھی نواکھلی اور بہار کے واقعات کا اعادہ ہوا تو اس قوم کی قسمت پر یقیناً مہر لگ جائے گی"۔

اعلانِ آزادی اور خدائی خدمتگاروں کی مشکلات:

ملکی حالات بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ اٹیلی Clement Attlee نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں جون

۱۹۴۸ء تک انتقال اقتدار کا عمل مکمل کر لیا جائے گا۔ ۲۲ مارچ کو لارڈ ویول Lord Wavell کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن Lord Mountbatten وائسرائے ہند کی حیثیت میں ہندوستان پہنچے۔ ان کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہندوستان میں انتقال اقتدار کے عمل کو پرامن طریقے سے پایہ تکمیل کو پہنچانا تھا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ برطانوی حکومت سے ہندوستانیوں کو انتقال اقتدار کے لئے ۱۵ اگست کی تاریخ چنی گئی۔ من جملہ دیگر امور اس منصوبے میں یہ شق بھی موجود تھی کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ پاکستان یا ہندوستان کا حصہ بننے کا فیصلہ بذریعہ ریفرنڈم کرے گا۔ کانگرس کی ترجمانی کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے تقسیم کا یہ منصوبہ تسلیم کر لیا تھا۔ ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس دہلی میں ہوا اور اس میں بھی تقسیم کے اس مجوزہ منصوبے کی تائید کی گئی۔ صوبہ سرحد میں اس منصوبے کے حوالے سے ملے جلے جذبات پائے جاتے تھے۔ مسلم لیگی تقسیم کے منصوبے اور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے انعقاد کے امکان پر کافی خوش تھے جبکہ خدائی خدمتگاروں کو یہی دونوں باتیں برانگیختہ کئے ہوئے تھیں۔ تاہم بدلتے ہوئے حالات میں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے مطابقت میں خود کو ڈھال لیا جائے۔ خدائی خدمتگاروں کو یہ یقین تھا کہ کانگرس تقسیم ہند کے منصوبے پر راضی نہیں ہوگی۔ انہیں کانگرس کے قائدین نے بار بار اس ضمن میں یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم کی ہر کوشش کی وہ مزاحمت کریں گے لہٰذا ان کی جانب سے تین جون کے منصوبے کی قبولیت خدائی خدمتگاروں کو ششدر کر گئی تھی۔ کانگرس نے تقسیم ہند کا یہ منصوبہ جس میں سرحد میں ریفرنڈم کی تجویز موجود تھی، سرحد کے کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ کسی قسم کی مشاورت کے بغیر تسلیم کر لیا تھا۔ کانگرس کے صدر جے کرپلانی نے محض ایک علامتی

احتجاج اس نکتے کے حوالے سے کیا تھا کہ ریفرنڈم میں سرحد کے پختونوں کو ایک تیسرے آپشن یعنی ”آزاد پختونستان“ کا اختیار بھی دیا جائے۔انہوں نے پختونستان کے حوالے سے اس صوبے کے عوام کے تقاضوں میں درآنے والی شدت کا ذکر وائسرائے سے بھی کیا تھا لیکن وائسرائے ہند نے ان کی یہ بات یہ کہتے ہوئے مسترد کر دی تھی کہ ہندوستان، پاکستان یا پھر آزادی کے تین آپشنز کی بنیاد پر صوبوں کو بذریعہ ووٹ فیصلے کرنے کا اختیار دینے کی تجویز خود پنڈت نہرو نے رد کی تھی اور اب اسی شق کو مجوزہ منصوبے میں دوبارہ شامل کرنے سے وہ معذور ہیں۔اس اقدام کے ذریعے کانگرس کے قائدین سرحد سے تعلق رکھنے والے کانگرسی رہنماؤں کو فقط یہ جتا رہے تھے کہ وہ ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے ہر ممکن راستہ اختیار کر چکے ہیں، تاہم حقیقت یہ تھی کہ وہ لوگ تقسیم ہند کے اس مجوزہ منصوبے سے دل و جان سے متفق تھے اور صرف صوبہ سرحد کے لئے پورے ہندوستان کا مستقبل داؤ پر لگانے کو وہ قطعی راضی نہیں ہو سکتے تھے۔وائسرائے کے انکار کے بعد کانگرس نے بلا چون و چرا اپنی تجاویز واپس لے کر اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا!!

کانگرس کی سنٹرل ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے بھی سرحد کے لئے ریفرنڈم کی شق رکھنے والے تقسیم کے اس منصوبے کی توثیق کر دی تھی۔خان عبدالغفار خان اس پر نہایت مضطرب اور ناخوش تھے کیونکہ انہیں کانگرس کی جانب سے بار بار یہ یقین دہانی ہو چکی تھی کہ تقسیم ہند کے کسی منصوبے کو کسی صورت قبول نہیں کیا جائے گا۔وہ کانگرس کے اس اقدام کو غداری کے مترادف ٹھہرا رہے تھے کیونکہ انہوں نے یہ منصوبہ ان کی مشاورت کے بغیر تسلیم کر لیا تھا۔انہوں نے کانگرس کو کہا تھا کہ ”ہم پختونوں نے ہمیشہ آپ لوگوں کا ساتھ دیا اور آزادی کے حصول کے لئے ہم نے بڑی بڑی قربانیاں دیں لیکن آپ لوگوں نے اب ہمیں

بے یارو مددگار چھوڑ کر بھیڑیوں کے آگے پھینک دیا ہے۔" ریفرنڈم کے حوالے سے انہوں نے کہا تھا کہ "ہم اس کے انعقاد پر راضی نہیں ہوں گے کیونکہ ہندوستان بمقابلہ پاکستان کے مسئلے پر ہم پہلے ہی سے انتخابات میں فیصلہ کن فتح حاصل کر چکے ہیں۔ اب جبکہ ہندوستان نے ہمیں از خود رد کر دیا ہے تو ریفرنڈم ہندوستان یا پاکستان کے مسئلے پر نہیں بلکہ پختونستان اور پاکستان کے مسئلے پر ہونا چاہئے!" ۱۸ جون کو خان عبدالغفار خان اور جناح صاحب کے درمیان ایک ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ خان عبدالغفار خان نے جناح کو بتایا کہ خدائی خدمت گار مشروط طور پر پاکستان کی حمایت کریں گے۔ جناح صاحب کا جواب یہ تھا کہ پہلے انہیں پاکستان میں شامل ہو جانا چاہئے اور اس کے بعد باہمی مفاہمت کے ذریعے دیگر مسائل حل کر لئے جائیں گے۔ خان عبدالغفار خان نے جناح صاحب کو بتایا کہ وہ اس معاملے پر اپنی جماعت کے افراد کے ساتھ مزید بات چیت کرنے کے بعد نتائج سے انہیں باخبر کر دیں گے۔

۲۱ جون کو سرحد کی کانگرس کمیٹی، خدائی خدمت گار تحریک اور ان سے وابستہ دیگر تنظیموں کا ایک مشترکہ اجلاس بنوں میں منعقد ہوا۔ تقسیم ہند کے منصوبے کی قبولیت کے بارے میں شرکاء کو تفصیلی معلومات دینے کے بعد خان عبدالغفار خان نے ان سے ان کی رائے طلب کی۔ کانگرس کی غداری پر وہ سب بہت برانگیختہ تھے اور نہایت مایوسی اور بددلی کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے ریفرنڈم کو مسترد کرتے ہوئے ایک آزاد اور خودمختار پختون ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا جہاں پختون روایات، ثقافت اور اقدار کی بنیاد پر جمہوریت، برابری اور معاشرتی انصاف کے اسلامی اصولوں کی روشنی میں ایک الگ آئین مرتب کیا جائے گا۔ تاہم خدائی خدمتگاروں کے بائیکاٹ کے باوجود ۶ تا ۱۷ جولائی ۱۹۴۵ء یہ ریفرنڈم منعقد ہوا اور اس کے نتائج کا اعلان ۲۰ جولائی کو کیا گیا۔ کانگرس نے پولنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ سرکاری نتائج کے

باچاخان قیام پاکستان کے بعد محمد علی جناح سے انکی سرکاری اقامت گاہ پر ملاقات کرر ہے ہیں

باچا خان پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کے ممبر کی حشیت سے حلف اٹھا رہے ہیں

مطابق پاکستان کے حق میں ۵۰.۴۹ فیصد ووٹ ڈالے گئے۔ خان عبدالغفار خان نے متعلقہ اہلکاروں پر الزام لگایا کہ وہ لیگ نوازی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ بقول ان کے "ہم نے چونکہ ریفرنڈم میں حصہ ہی نہیں لیا تھا اس لئے مسلم لیگ کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہی نہیں تھی۔"

قیام پاکستان اور خدائی خدمتگار:

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ خدائی خدمتگاروں کو اپنی مرضی کے برعکس ایک ایسی ریاست کا حصہ بننا پڑا تھا جس کے خلاف کچھ عرصہ قبل تک وہ جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ پاکستان کو مسلم لیگ کا صرف ایک انتخابی حربہ سمجھتے تھے لیکن اب وہی ایک حقیقت کی صورت میں ان کے سامنے موجود تھا۔ ان تبدیل شدہ حالات میں خدائی خدمتگار اور ان سے وابستہ دیگر تنظیموں کا ایک مشترکہ اجلاس پشاور کے قریب سردریاب میں ۳ تا ۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا جس میں ان سب نے نئی ریاست کے ساتھ اپنی وفاداری کا حلف لیا۔ تاہم صوبائی حکام نے خدائی خدمت گاروں کی شدید مخالفت کے لئے بدنام وزیرِاعلیٰ عبدالقیوم کی قیادت میں ان کے خلاف جبر اور تشدد کی ایک مہم شروع کر دی تھی۔ ۲۳ فروری ۱۹۴۸ء کو خان عبدالغفار خان نے دستور ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت میں ایوان کے اولین اجلاس میں شرکت کی اور پاکستان کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا۔ جناح صاحب خان عبدالغفار خان کے اس مثبت رویئے سے بہت متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے انہیں اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ خان عبدالغفار خان نے ان سے کہا کہ وہ سرحد آ کر کچھ وقت خدائی خدمت گاروں کے ساتھ گزاریں جس پر جناح صاحب نے رضامندی ظاہر کی۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں جناح صاحب سرحد آئے تاہم انہوں نے سردریاب میں خدائی خدمتگاروں سے ملنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے خان عبدالغفار خان کو پشاور

آنے کی دعوت دی۔ خان عبدالغفار خان پشاور جا کران سے ملے تو جناح صاحب نے انہیں
مسلم لیگ میں شمولیت کی پیش کش کی۔ انہوں نے اس پیش کش کی قبولیت سے خود کو معذور
ظاہر کیا۔ اس طرح یہ ملاقات ناکام رہی۔ خان عبدالغفار خان نے الزام لگایا کہ صوبائی
انتظامیہ اور خصوصاً وزیراعلیٰ عبدالقیوم نے جناح صاحب اور خدائی خدمت گاروں کے درمیان
غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔

سیاسی سرگرمیاں، 'ون یونٹ' کالا باغ ڈیم اور جلاوطنی:

مارچ ۱۹۴۸ء میں خان عبدالغفار خان، عبدالصمد خان اچکزئی، جی ایم سید،
عبدالمجید سندھی اور بعض دیگر "قوم پرستوں" سے ملے اور مسلم لیگ کی حکومت کی زیادتیوں
کے خلاف انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی۔ ان کی مشترکہ کوششیں پیپلز پارٹی کے
قیام پر منتج ہوئیں۔ یہ پاکستان کی پہلی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں کی اصلاً حزب اختلاف کی
جماعت تھی۔ ۸ مئی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں اس مذکورہ جماعت
کے قیام کا اعلان ہوا۔ خان عبدالغفار خان اس کے صدر اور جی ایم سید سیکرٹری مقرر کئے
گئے۔ کراچی سے اپنی واپسی پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس نئی جماعت کو ملک گیر سطح پر مقبول
کرانے کی سعی ہونی چاہئے۔ اسی غرض سے انہوں نے صوبہ سرحد کا دورہ شروع کیا۔ ۱۵ جون کو
انہیں کوہاٹ کے قریب سے گرفتار کر کے تین سال قید بامشقت سنائی گئی۔ ان کی گرفتاری کے
بعد خدائی خدمتگار تحریک پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس تنظیم سے وابستہ افراد کے خلاف
کریک ڈاؤن شروع ہو گیا۔ تین سال کی مدت کے اختتام کے بعد خان عبدالغفار دوبارہ
گرفتار کر لئے گئے اور ایک بار پھر انہیں تین سال کی سزا سنا دی گئی۔ بالآخر ۱۹۵۴ء میں وہ رہا کر
دیئے گئے۔ رہائی کے بعد جلد ہی انہوں نے ون یونٹ منصوبے کے خلاف جدوجہد میں حصہ

ون یونٹ کیخلاف محاذ کے مرکزی رہنما

دائیں اور بائیں غلام مصطفیٰ بھرگری (جنہوں نے یونٹ کیخلاف یونٹ ہی کی اسمبلی میں قرارداد پیش کی اور متفقہ طور پر منظور کرائی)۔
شیخ عبدالمجید سندھی، باچاخان، عبدالصمد خان اچکزئی، محمد حسین عنقاء، پیچھے کھڑے ہوئے حیدر بخش جتوئی، جی ایم سید اور نامعلوم

فخر افغان باچا خان کی میت لحد میں اتاری جا رہی ہے، رہبر تحریک خان عبدالولی خان کے ہمراہ افغان صدر ڈاکٹر نجیب شہید، بھارتی صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما، افغانستان کے وزیر اعظم سلطان علی کشتمند کھڑے ہیں، خان عبدالعلی خان نے تابوت کو پیروں کی طرف سے پکڑ رکھا ہے

لینا شروع کر دیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت سندھ، سرحد اور پنجاب کا ادغام کر کے ایک واحد انتظامی اکائی کی صورت دی گئی تھی۔ خان عبدالغفار خان اس اقدام پر نکتہ چینی کر رہے تھے لہٰذا ۱۶ جون ۱۹۵۶ء کو انہیں ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ ۲۷ جنوری ۱۹۵۷ء کو انہوں نے پاکستان نیشنل پارٹی میں اپنی شمولیت کا اعلان کیا۔ جولائی ۱۹۵۷ء میں ڈھاکہ کے مقام پر انہوں نے مولانا عبدالحمید خان بھاشانی، جی ایم سید اور میاں افتخار الدین کے ساتھ مل کر نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو خان عبدالغفار خان دیگر ممتاز قوم پرستوں کے ہمراہ گرفتار کر لئے گئے۔ چار اپریل ۱۹۵۹ء کو ان کی رہائی عمل میں آئی۔ رہا ہونے کے بعد انہوں نے صوبے بھر کا دورہ کیا اور ایک بار پھر عوام کو حکومت کے جابرانہ قوانین کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی۔ ۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو وہ ایک بار پھر گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر ریاست مخالف سرگرمیوں، ملائیت پرستی کے فروغ، عوام میں افراتفری اور مختلف طبقات میں باہمی نفرت کو ہوا دینے کا الزام لگایا گیا تھا۔ پھر ۳۰ جنوری ۱۹۶۴ء کو انہیں خرابیٔ صحت کی بنیاد پر آزادی مل سکی۔ ستمبر ۱۹۶۴ء میں انہیں علاج کی غرض سے انگلستان جانے کی اجازت دی گئی۔ لندن سے انہوں نے افغانستان کا رخ کیا اور دسمبر ۱۹۶۴ء میں کابل پہنچے۔ وہاں انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر ۱۹۷۰ء کے عشرے کے وسط تک وہیں مقیم رہے۔ بھٹو کے دور حکومت میں وہ پاکستان واپس لوٹ آئے تھے۔ خان عبدالغفار خان کی باقی ماندہ زندگی معاشرتی اصلاح کی سرگرمیوں میں بسر ہوئی۔ تاہم ۱۹۵۰ء کے وسط سے انہوں نے کالاباغ ڈیم کی تعمیر کے خلاف ایک بھرپور مہم شروع کر رکھی تھی اور کالاباغ ڈیم کے حوالے سے وہ آخر تک جدوجہد میں مصروف رہے۔ یہ مجوزہ ڈیم ان کے خیال کے مطابق پختونوں کے مفادات کیلئے نقصان دہ تھا۔

وفات:

خان عبدالغفار خان نے ۲۰ جنوری ۱۹۸۸ء کو اٹھانوے برس کی عمر میں وفات پائی۔ان کا جسدِ خاکی ایک جلوس کی صورت میں ان کی وصیت کے مطابق تدفین کے لئے افغانستان کے شہر جلال آباد لے جایا گیا۔ وہاں شیشم باغ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ان کی نماز جنازہ میں افغانستان کے صدر ڈاکٹر نجیب اللہ وزیر اعظم اور بھارت کے نائب صدر (بعد میں صدر) ڈاکٹر شنکر دیال شرما سمیت لاکھوں لوگ موجود تھے۔وہ سب جدوجہد آزادی کے اس ممتاز ترین زعیم کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے جس نے نہ صرف برطانوی استبداد بلکہ اس کے بعد پاکستان کی مطلق العنان اور آمرانہ حکومتوں کا بھی مقابلہ کیا تھا۔خان عبدالغفار خان کے پیروکاروں کی تعداد اب بھی لاکھوں میں ہے۔یہ لوگ شمال مغربی سرحدی صوبے (پختونخوا) کی سیاست میں ایک غالب کردار کے مالک ہیں اور اس طرح جنوبی ایشیاء کے اس حصے میں وہ خان عبدالغفار خان کی سیاسی میراث کی فروغ اور ترویج کا ذریعہ بن رہے ہیں۔